مددگار لیمیٹیڈ

ڈاکٹر صابر علی ہاشمی

ناول

مددگار لمیٹڈ

صابر علی ہاشمی

صبح کے گیارہ بج رہے تھے جب وہ سہراب گوٹھ پہنچی تھی۔ اس نے پل پار کرنے کے بعد ٹرک اسٹینڈ کے سامنے جھگی ہوٹل کے پاس گاڑی کھڑی کردی۔ مووی کیمرہ اس نے ہاتھ بڑھا کر اُٹھا لیا تھا۔ اس نے کیمرے کو فوکس کیا اور ٹرک اسٹینڈ کے پیچھے بجری اُٹھا اُٹھا کر ٹرک میں لادنے والے بچوں کی متحرک فلم اپنے کیمرے پر منتقل کرنے لگی۔ بازہ مارکیٹ کے بعد آگے فلیٹ بن رہے تھے' یہاں بھی مزدوروں کے ساتھ بچے کام کر رہے تھے' اسی طرح وہ مختلف جگہوں سے ہوتی ہوئی کافی دور تک چلی آئی تھی......

مجبوریوں کی راہ میں

رات اچھی خاصی بیت چکی تھی۔

طارق روڈ پر اچھی خاصی رونق تھی۔ عام دنوں میں تو اس مارکیٹ میں ویسے بھی رات کے گزرنے کا پتا نہیں چلتا' لیکن عید قریب ہونے کی وجہ سے ان دنوں معمول سے زیادہ ہی رش تھا۔ رونق تو کراچی کے ہر بازار میں تھی لیکن یہاں جن لوگوں کا رش تھا' وہ یا تو کاروباری طبقے سے تعلق رکھتے تھے' یا پھر اچھی خاصی آمدنی والے تھے۔

وہ دیکھنے میں خوبصورت تھا' اچھے خاصے خدوخال تھے' لیکن چہرے سے نقاہت ظاہر ہو رہی تھی۔ کپڑے بھی بس معمولی سے پہن رکھے تھے۔ بازار میں مسلسل اِدھر اُدھر ٹہل رہا تھا۔

''امی...... بھوک لگی ہے......''

وہ چونک گیا' اس نے پلٹ کر دیکھا' ایک چار پانچ سال کا بچہ ایک حسین و جمیل خاتون کا دامن پکڑ کر مچل رہا تھا۔

''بھوک......!'' اس نے سوچا...... بھوک تو اسے بھی لگی ہے' اس کی بہن اور ماں بھی انتظار کر رہی ہوں گی کہ وہ کچھ کھانے کو لے کر آئے گا۔ صبح سے وہ جب گھر سے نکلا تھا تو اس نے اپنی ماں سے کہا تھا:

''ماں! دعا کرو آج کام مل جائے...... میں رات کو آتے ہوئے گرما گرم کباب روٹی لے کر آؤں گا۔''

مسلسل ایک ماہ سے وہ نوکری تلاش کر رہا تھا۔

میٹرک میں تھا تو والد کا سایہ سر سے اُٹھ گیا تھا۔ اس نے ایک کارخانے میں ہیلپر کے طور پر کام کرنا شروع

کردیا تھا۔ باپ بھی اس کارخانے میں مشین مین تھا۔ ماں محلے کے کپڑے سی کر کسی نہ کسی طرح پورا مہینہ گزارتی تھی۔ باپ کی تنخواہ میں سے مکان کا کرایہ نکال کر جو رقم بچتی تھی' اس میں وہ کس طرح گھر چلاتی تھی' صرف وہی اس راز سے واقف تھی۔

ایک دن باپ ڈیوٹی پر گیا تو شام کو لاش کی صورت میں واپس آیا۔ لانے والوں کا کہنا تھا کہ بس اسٹاپ پر کھڑے کھڑے وہ اچانک گر پڑا تھا' شاید دل کا دورہ پڑا تھا' وہ بھی اتنا شدید کہ پہلے ہی دورے میں چل بسا تھا۔ قریبی کلینک کے ڈاکٹر نے اس کی تصدیق کردی تھی کہ اب اسے اسپتال لے جانا بے کار ہے' لہٰذا اس کے ساتھی اسے گھر کے صحن میں چارپائی پر ڈال کر چلے گئے تھے۔

پہلے ہفتے تو وہ گم صم سا رہا' پھر اچانک اسے خیال آیا کہ اس پر بہت سی ذمہ داریاں آ پڑی ہیں۔ اس کے اگلے دن وہ سپر ٹیک کمپنی میں ہیلپر کے طور پر کام کرنے پہنچ گیا تھا۔ کمپنی کے منیجر کی مہربانی تھی' ورنہ اس دور میں نوکری ملنا کار مشکل ہے۔

زندگی کی گاڑی پھر چل پڑی تھی۔ اگلے دو برسوں میں اس نے پرائیویٹ انٹر کیا' پھر بی اے کے لیے رجسٹریشن کروالی۔ جس روز بی اے پارٹ ون کا رزلٹ آیا' اس روز شہر میں ہنگامے پھوٹ پڑے' مسلسل پانچ روز تک وہ کارخانے نہ جاسکا۔ پھر جب حالات معمول پر آئے تو کارخانے پہنچ کر اسے معلوم ہوا کہ آج کام بند ہے۔ کارخانے کے ملازمین نے تنخواہ بڑھانے کے لیے ہڑتال کررکھی تھی۔ شہر کے ہنگامے اور ہڑتال دونوں جاری رہے' پندرہ دن بعد جن چالیس افراد کو کارخانے سے حسابات ملے' ان میں وہ بھی شامل تھا۔

کمپنی نے روزانہ اجرت والوں کی چھانٹی کردی تھی۔ اس نے دوسری کمپنی میں کوشش کی' وہاں تنخواہ کم اور کام زیادہ تھا...... وہ مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق وہاں کام کرنے لگا' لیکن یہ نوکری بھی عارضی ثابت ہوئی' کمپنی میں کام کی کمی کے باعث اس کی کمی کردی گئی۔!

اس کے بعد وہ کوشش ہی کرتا رہا' لیکن کوئی ملازمت اس کے مقدر میں نہ تھی۔ پندرہ روز تک وہ بھوک پیاس اور تھکن برداشت کرتا رہا۔

رمضان کا مہینہ شروع ہونے کے بعد بھی اس نے اپنے معمولات جاری رکھے' وہ سحری کے بعد کام کی تلاش میں نکلتا اور افطار کے وقت جب گھر میں داخل ہوتا تو گھر میں کھانے کو بھی نہ ہوتا تھا۔ بہرحال اس کی ماں کسی نہ

کسی طرح گزارہ کر رہی تھی۔

آج...... ہاں آج...... اس کی ماں نے واضح کر دیا تھا کہ اب تک جو کچھ تھوڑا بہت مل بھی رہا تھا وہ کل سے شاید نہ ملے۔ اس کی رات بڑی بے چینی میں کٹی تھی۔ وہ صبح سویرے ہی کام کی تلاش میں نکلا تھا...... اس نے ماں اور بہن کو آس تو دلا دی تھی لیکن وہ جانتا تھا کہ یہ اس کی بس کی بات نہیں ہے۔ تب پھر اچانک ہی صدر میں ٹہلتے ہوئے اس کے ذہن میں ایک خیال آیا تھا۔

افطار کا وقت قریب تھا۔ وہ صدر بازار میں گھوم رہا تھا۔ لوگ پھلوں اور دیگر اشیاء کے ٹھیلوں اور دکانوں پر بھیڑ لگائے کھڑے تھے۔ ہر کوئی چاہتا تھا کہ اسے سب سے پہلے فارغ کر دیا جائے تاکہ وہ گھر پہنچ کر اپنے گھر والوں کے ساتھ افطار کر سکے' لیکن اسے کوئی جلدی نہ تھی۔

اس کے پاس تھا ہی کیا' جو وہ کوئی چیز خریدتا...... وہ تو پیدل چلتا رہا تھا۔ بہر حال مغرب کی اذان ہوئی اور کچھ افراد نے قریب کھڑے ہوئے لوگوں میں کھجوریں تقسیم کرنا شروع کر دیں۔

اس نے اپنے ہاتھ کی طرف دیکھا' وہاں دو کھجوریں تھیں' اذان کے ساتھ ہی اس نے بسم اللہ اور دعائے افطار پڑھ کر ایک کھجور اپنے منہ میں ڈال لی اور اسے پھندا لگ گیا۔

کیا ماں اور گڑیا نے بھی افطار کیا ہوگا؟ گھر میں تھا ہی کیا......؟ اس سے وہ کھجور نگلی نہ گئی۔ بہر حال کسی نے چند پکوڑے بھی بڑھا دیے تھے۔ وہ پکوڑے نگل کر پانی کی تلاش میں نظریں دوڑانے لگا تو ایک صاحب نے ایک گلاس میں پانی ڈال کر اس کی جانب بڑھا دیا۔

مغرب کے بعد صدر کی رونق بڑھ گئی تھی' وہ مختلف ٹھیلوں اور دکانوں کو دیکھتا ہوا' وہاں سے چل پڑا' پھر وہ نہ جانے کیسے اور کب طارق روڈ جا پہنچا' اسے خبر بھی نہ ہوئی۔

اس وقت شاید رات کے دس بج رہے تھے' جب اس کے کانوں میں اس بچے کی آواز آئی: ''امی...... بھوک لگی ہے۔''

''آؤ بیٹے...... برگر دلا دوں۔'' اس خاتون نے بچے سے کہا اور اس کی انگلی پکڑ کر اس کے قریب سے گزر کر پیچھے موجود برگر پوائنٹ میں داخل ہو گئی۔

وہ مسلسل اسے ہی دیکھے جا رہا تھا۔ خاتون نے ایک برگر اور ایک ٹھنڈی بوتل لے کر اپنا پرس کھولا اور سو

روپے کے نوٹوں کی گڈی نکال کر ایک نوٹ کھینچا۔ کاؤنٹر پر وہ رقم ادا کر کے جب لوٹی تو اس کے ذہن میں دھماکے ہو رہے تھے۔

تھوڑی دیر بعد وہ اس خاتون کے تعاقب میں تھا۔



شگفتہ نے میز سے اپنا پرس اٹھایا اور دفتر سے نکل آئی۔

لفٹ کے ذریعے وہ گراؤنڈ فلور پر آئی اور بلڈنگ سے باہر نکل کر اس نے پارکنگ لاٹ کا رُخ کیا۔ آدھے گھنٹے کے بعد وہ کلفٹن کے علاقے میں تھی۔ اس کا رُخ کلفٹن تھانے کی جانب تھا۔

جس وقت اس کی گاڑی تھانے کے مین گیٹ سے اندر داخل ہوئی اسی وقت ایک پجیرو بڑی تیزی سے اس کے پیچھے آئی اور ڈرائیور نے بڑی مہارت سے اس کی گاڑی کو بچاتے ہوئے اس کے برابر ہی کھڑی کر دی۔

شگفتہ اپنی گاڑی سے باہر نکلنے ہی والی تھی لیکن پجیرو کے رکنے کے بعد اس نے کچھ دیر رکنے کا ارادہ کیا اور اس کے گیٹ کی طرف دیکھنے لگی۔ ایک کیم شیم شخص قیمتی سوتی شلوار قمیض پہنے ہاتھ میں موبائل فون لیے دروازے سے باہر نکلا اور اس کے ساتھ ہی پچھلے دروازوں سے جدید اسلحے سے لیس خونخوار قسم کے چار افراد اس کی حفاظت کے لیے آگے پیچھے کھڑے ہو گئے۔

ڈرائیور بھی شکل سے انہی کے قبیل کا شخص لگ رہا تھا لیکن وہ اپنی سیٹ پر بیٹھا رہا' اس شخص نے قدم بڑھائے اور تھانے کی عمارت کی جانب بڑھا' اس کے گارڈ اس کے ہمراہ تھے۔

شگفتہ نے گاڑی کے اندر ہی بیٹھے دیکھا کہ تھانے میں موجود ہر شخص' خواہ اس کا عہدہ کوئی بھی ہو' ''جی سائیں'' اور ''سلام سائیں'' کہہ رہا تھا۔

اس شخص کے عمارت میں داخل ہونے کے بعد شگفتہ بھی اپنی گاڑی سے نکلی اور تھانے کی عمارت میں داخل ہو گئی۔ اس کا رخ انچارج کے کمرے کی جانب تھا۔ وہ آج پہلی مرتبہ کلفٹن تھانے میں آئی تھی۔ اس کی یہاں آمد بلاوجہ نہیں تھی۔

دو روز قبل شرجیل نے اسے فون کیا تھا' اس وقت وہ دفتر میں موجود تھی' شرجیل نے اسے بتایا تھا کہ وہ ایک خاتون کو اس کے پاس بھیج رہا ہے' اس سے متعلق معلومات حاصل کر کے اس کیس پر کام کرنا ہے۔

فون آنے سے قبل وہ کہیں جانے کی تیاری کر رہی تھی لیکن اب اسے اس خاتون کا انتظار کرنا تھا۔ وہ خاتون نہ جانے کس کس سے پتا دریافت کرتی ہوئی مددگار لمیٹڈ کے دفتر پر دو گھنٹے بعد پہنچی تھی۔ حلیے سے وہ غریب آبادی سے تعلق رکھنے والی نظر آتی تھی' خاتون کی عمر اچھی خاصی تھی۔ انہوں نے اپنا نام ہاجرہ خاتون بتایا تھا۔ کچھ بتانے سے پہلے انہوں نے ایک اخبار اس کے سامنے رکھ دیا تھا۔

''کیا ہے اس اخبار میں......؟'' شگفتہ نے میز پر رکھے اخبار کو دیکھتے ہوئے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا تھا۔

''مجھ دکھیاری کی کہانی ہے بیٹی۔'' انہوں نے ڈبڈبائی آنکھوں کے ساتھ جواب دیا۔

''کیا مطلب؟ میں سمجھی نہیں......'' شگفتہ نے حیرانی سے کہا اس نے میز سے اخبار اُٹھا لیا تھا۔ ایک تین کالمی خبر کے گرد حاشیہ لگا کر اسے نمایاں کیا گیا تھا۔ خبر کے مطابق بے شمار ڈکیتیوں میں ملوث ایک شخص سلمان کو کلفٹن پولیس نے باقاعدہ مقابلے کے بعد گرفتار کر لیا تھا۔ سلمان نے اقرار کیا تھا کہ وہ گزشتہ تین سال سے ڈکیتیاں کر رہا تھا۔ پولیس اس کے ساتھیوں کی تلاش میں چھاپے مار رہی تھی۔

''سلمان' آپ کا کیا لگتا ہے۔؟''

''بیٹا ہے میرا' میرا اکلوتا بیٹا...... وہ ایسا نہیں کر سکتا۔''

ہاجرہ خاتون نے روتے ہوئے بتایا۔

''آپ کیسے کہہ سکتی ہیں جبکہ وہ پولیس کے سامنے اقرار کر چکا ہے۔'' شگفتہ نے ان سے پوچھا۔

''پولیس نے بہت مارا ہے اسے۔ وہ ان کی مرضی کا بیان نہ دیتا تو کیا کرتا' وہ اسے جان سے مار دیتے۔''

ہاجرہ خاتون کی ہچکیاں بندھ گئی تھیں۔

''بہرحال آپ مجھے پوری تفصیل بتائیں اور یہ یاد رکھیں کہ اگر سلمان بے قصور ہے تو اس کا کچھ نہیں بگڑے گا' اور اگر واقعی یہ سب سچ ہے تو اسے قانون کے مطابق سزا بھگتنا ہوگی۔'' شگفتہ نے کہا۔

ہاجرہ خاتون نے روتے روتے اسے جو داستان سنائی' اس کے مطابق سلمان کے والد کے انتقال کے بعد وہ ایک کارخانے میں ملازمت کر رہا تھا' جس سے اس کی بہن اور والدہ کے اخراجات بمشکل پورے ہوتے تھے' پھر اس کی نوکری ختم کر دی گئی۔ اس نے کئی جگہوں پر عارضی بنیادوں پر کام کیا۔ شہر کے حالات خراب ہونے کے بعد اسے چھوٹے موٹے کام ملنا بھی بند ہو گئے تھے۔ تین سال قبل اسے کسی جگہ اچھی ملازمت مل گئی تھی' اب

تک وہ وہ کیا کام کرتا رہا' اس کی خبر اس کی والدہ اور بہن کو نہ تھی لیکن کل جب پولیس نے گھر آ کر اس کی گرفتاری کی خبر دی تو انہیں یقین نہ آیا اور پھر ہاجرہ خاتون نے کئی وکیلوں سے بات کی لیکن سب منہ مانگا معاوضہ مانگ رہے تھے...... بہر حال یہ ایک نامور ڈکیت کا معاملہ تھا اور کیس میں جان بھی نہ تھی کیونکہ اسے رنگے ہاتھوں پکڑا گیا تھا۔ وہ مختلف لوگوں کی منت سماجت کر رہی تھی کہ اسے شرجیل مل گیا' جس نے اسے یہاں کا پتا دے دیا تھا۔

''بیٹی! سلمان میرے بڑھاپے کا سہارا ہے اور اپنی بہن کی امیدوں کا آسرا بھی۔ میرے سہارے کو بچالو بیٹی...... میں بہت امیدیں لے کر آئی ہوں۔'' ہاجرہ خاتون کے چہرے کی جھریاں روتے روتے مزید ابھر گئی تھیں' ان پر گویا بڑھاپے نے ایک دم حملہ کر دیا تھا۔



''ارے سائیں ہم تو خادم ہیں آپ کے۔'' ریوالونگ چیئر پر بیٹھے ہوئے تھانہ انچارج نے حد درجہ انکسار کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا۔

''تو پھر اس لڑکے کو ہمارے حوالے کر دو۔'' بارعب شخص نے گویا ایک طرح سے حکم دیا تھا۔ اسی وقت شگفتہ دروازے سے اندر داخل ہوئی تھی اس نے آخری جملہ سن لیا تھا۔

اسے اندر آتے دیکھ کر وہ دونوں خاموش ہو گئے۔

''ہاں...... میڈم! کیا کام ہے آپ کو؟'' تھانہ انچارج جو سادہ لباس میں بیٹھا تھا' شگفتہ کو دیکھ کر بولا:

''میں فری لانس صحافی ہوں اور......'' اس کا جملہ ادھورا ہی رہ گیا تھا۔

''ارے بابا...... تو ادھر کیا کرنے آیا ہے۔ ادھر انچارج کے کمرے میں جاؤ۔ میرا وقت بہت قیمتی ہے بابا' میں بہت مصروف ہوں اس وقت۔'' اس کا لہجہ اچانک ہی تبدیل ہو گیا تھا۔

''اشرف خاں لاشاری آپ ہی ہیں؟'' شگفتہ نے اس کی بات پر کان دھرے بغیر پوچھا۔

''ہاں بابا' میں ہی لاشاری ہوں۔ ابھی آپ باہر بیٹھو انچارج کے پاس جاؤ۔ میں حاکم خان صاحب سے ملنے کے بعد آپ سے ملوں گا...... جاؤ بی بی۔'' اس نے میز کے کنارے پر ہاتھ رکھ کر غالباً گھنٹی بجائی تھی' کیونکہ ایک سپاہی فوراً ہی حاضر ہو گیا تھا۔

''سر!'' اس نے اندر آ کر سیلوٹ کیا تھا۔

''بابا...... بی بی کو بشیر کے پاس لے جاؤ۔'' اس نے یہ حکم گویا شگفتہ کو بھی دیا تھا۔
شگفتہ خاموشی سے باہر آ گئی تھی' وہ سپاہی اسے لے کر دوسرے کمرے میں آ گیا تھا' یہاں چند پولیس والے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ شگفتہ کو آتے دیکھ کر وہ خاموش ہو گئے تھے۔
''جی میڈم۔؟'' انچارج کی تختی کے پیچھے بیٹھے ایس آئی نے شگفتہ کی بااعتماد شخصیت سے قدرے مؤدب ہوتے ہوئے پوچھا۔
''مجھے لاشاری صاحب سے ملنا ہے۔'' شگفتہ نے جواب دیا تھا۔ ''فری لانس صحافی ہوں میں۔''
''او! اچھا...... رپورٹر ہو آپ......!'' ایس آئی نے مضحکہ خیز ہنسی میں کہا۔ ''ہم بھی خدمت کے لیے ہی بیٹھے ہیں۔ آپ مجھے اپنا مسئلہ بتاؤ۔''
''مجھے انہی سے ملنا ہے۔'' شگفتہ نے اصرار کیا۔
''آپ کو انتظار کرنا ہو گا جی' اس وقت حاکم صاحب سے میٹنگ چل رہی ہے۔''
''بہتر...... میں انتظار کر لوں گی۔'' شگفتہ کا لہجہ روکھا ہو گیا تھا' جسے ایس آئی نے بھی محسوس کر لیا تھا اور خاموش ہو گیا تھا۔
ادھر حاکم خاں ایس ایچ او لاشاری سے کہہ رہا تھا:
''تم تو جانتے ہو لاشاری' مجھے ایسے نوجوان سے کتنی ہمدردی ہے' بس اب تم اپنا خرچا پانی لو اور اس نوجوان کو میرے حوالے کر دو۔''
''لیکن سائیں! اب تو کچھ ہو ہی نہیں سکتا...... اس کا پرچا کٹ چکا ہے اور کل عدالت میں پیش کر دیا جائے گا اسے' اب میرے ہاتھ میں کچھ بھی نہیں ہے۔'' لاشاری نے واقعتاً ہاتھ ملتے ہوئے کہا تھا۔
''ارے یہ قانون وانون نہ سکھاؤ مجھے' سب جانتا ہوں میں۔'' حاکم خاں کا لہجہ گرجدار تھا۔
''سائیں' اب تو عدالت سے ضمانت......!'' اس کا جملہ ادھورا رہ گیا تھا۔
''ٹھیک ہے...... ٹھیک ہے باقی معاملہ تم سنبھال لینا۔ کل میرا وکیل پہنچ جائے گا عدالت میں...... اب چلتا ہوں۔'' حاکم خاں اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔
''سائیں! کوئی خدمت کا موقع تو دیتے۔'' لاشاری گویا بچھا جا رہا تھا۔

''پھر کبھی...... موقعے تو آتے رہیں گے۔'' حاکم خاں کھڑا ہوا تو لاشاری نے بھی کرسی چھوڑ دی تھی۔ وہ خود اس کے ساتھ ساتھ باہر تک آیا تھا۔

''خیال رکھنا لاشاری......'' گاڑی میں بیٹھنے کے بعد حاکم خاں نے کہا تھا اور لاشاری ''جی سائیں'' کہہ کر رہ گیا تھا۔

اپنے کمرے میں آنے کے بعد لاشاری نے گھنٹی بجا کر سپاہی کو بلایا تھا۔

''بشیر کو بلاؤ۔''

تھوڑی دیر کے بعد ایس آئی بشیر اس کے سامنے تھا۔

''یس سر!'' بشیر نے سیلوٹ کیا تھا۔

''نئے پنچھی کا کیا حال ہے۔؟''

''اب تک اکڑ باقی ہے سر...... لیکن صبح تک اکڑ ختم ہو جائے گی...... آپ فکر نہ کریں۔'' بشیر نے خالص پولیس والوں کی زبان میں جواب دیا تھا۔

''زبیر خان کو بلا کر کہہ دو کہ اسے حاکم خان کا پیغام پہنچا دے اب وہ حاکم کا بندہ ہے...... سمجھ گئے......'' لاشاری نے گویا اسے ہدایت دی تھی۔

''او کے سر......'' بشیر نے ایڑیاں بجائیں۔

''اور کچھ......؟''

''سر! وہ ایک رپورٹر صاحب آپ سے ملنے کے لیے میرے دفتر میں بیٹھی ہے...... آپ کہیں تو......؟'' اس نے جملہ ادھورا چھوڑ کر اس کی طرف دیکھا۔

''ٹھیک ہے' بھیج دو اسے۔'' لاشاری نے اسے جواب دیا...... ایس آئی بشیر سیلوٹ کر کے کمرے سے باہر چلا گیا۔



''خادم حاضر ہو سکتا ہے......'' ناک پر چشمہ درست کرتے ہوئے شوکت نے دفتر کے دروازے سے گردن اندر نکالتے ہوئے پوچھا تھا۔

آ جاؤ' تمہارا ہی انتظار ہو رہا تھا' جلدی سے بیٹھو اور نئے مسئلے پر سوچو۔'' شگفتہ نے کہا'' کیا ہے وہ مسئلہ؟'' شوکت نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''سلمان......'' شرجیل نے اس کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''ایک راہ زن......ایک لیٹرا......عورتوں کے پرس چھین کر بھاگنے والا' مجبوریوں کی پوٹلی، ایک لاچار ماں اور ایک بہن کا آسرا......اور اب ایک بااثر شخص اس کی مجبوریوں سے فائدہ اُٹھا کر اسے مضبوط اور پختہ مجرم بنانا چاہتا ہے......اور کچھ عرض کروں یا......'' شوکت نے اپنی ناک پر چشمہ اُٹھا کر دوبارہ جمایا۔

''شوکی......شوکی......تم تو چھپے رستم نکلے۔ ارے بھئی اتنی معلومات تو ہم بھی حاصل نہیں کر سکے۔ اور یہ آپ کے کزن محترم شرجیل صاحب جو اس کا کیس لڑنے کی تیاری کر رہے ہیں' یہ بھی شاید تمام حالات سے واقف نہیں ہیں......پھر تم یہ سب کیسے جانتے ہو......؟'' شگفتہ فرط حیرت سے اُٹھ کر اس کی کرسی کے پاس آ گئی تھی۔

''مابدولت نہ تو ڈی آئی جی کی اولاد ہیں اور نہ کسی بیرسٹر کی......لیکن عقل تو رکھتے ہیں اور وسائل بھی' اپنے ہر جگہ تعلقات ہیں۔'' شوکت نے گردن اکڑاتے ہوئے جواب دیا تھا۔

''اچھا اب زیادہ اکڑو نہیں......اکڑو خان! کل عدالت سلمان کو جیل بھیج دے گی' تمہیں اس سے ملنا ہے اور مکمل معلومات کے بعد شرجیل کو بتانا ہے۔ میں کل دوسری مہم پر نکلوں گی۔'' شگفتہ نے اسے ہدایت کرتے ہوئے کہا۔

''کہو تو میں حاکم خان کی مکمل ہسٹری خود کل تک تمہیں پہنچا دوں' تم کیوں تکلیف کرتی ہو'' شوکت نے کہا۔

''تم کیا جانتے ہو حاکم خان کے متعلق؟'' شگفتہ چونک گئی تھی۔

''اسٹاک ایکسچینج کے بادشاہوں میں شمار ہوتا ہے' حاکم انڈسٹریز سمیت لفظ ''حاکم'' سے شروع ہونے والے جتنے ادارے یہاں کام کر رہے ہیں' سب اسی کی ملکیت ہیں......تمہارے بس کی بات نہیں ہے' اگر اس کے کتوں کو تمہاری بھنک مل گئی تو اس طرح غائب کریں گے کہ تمہارا نام ونشان بھی نہیں ملے گا۔'' شوکت نے نہایت سنجیدگی سے معلومات بہم پہنچائی تھیں۔

''تم حیرت انگیز ہو شوکت احمد صدیقی! شگفتہ نے کہا۔ جب وہ حد درجہ سنجیدہ ہوا کرتی تھی تو اس کا پورا نام لیا کرتی تھی۔

''شگفتہ اب جبکہ تم سنجیدہ ہو تو سنو......'' شوکت نے کہنا شروع کیا۔'' حاکم خان کو میرے لیے چھوڑ دو۔

سلمان کے علاقے سے تمام معلومات تم حاصل کرو۔ شرجیل اس کے کیس کی تفصیلات کا جائزہ لے گا اور کل وکالت نامے پر سائن کرانے کے بعد کوشش کرے گا کہ اس کی کوئی ضمانت نہ لے سکے۔ فی الحال سب سے اہم بات یہی ہے باقی میں کل شام کی میٹنگ میں بتاؤں گا۔'' وہ دروازے سے باہر نکل گیا۔

شگفتہ کو اچانک ہی کوئی خیال آیا تھا۔'' کیوں نہ بھورے ماموں کی ڈیوٹی لگائی جائے سلمان کے علاقے کے لیے' وہ بھی تو آخر مددگار لمیٹڈ کے ایک رکن ہیں۔''

''ہاں یہ ٹھیک ہے' تم بلاؤ ماموں کو میں بات کرتا ہوں ان سے......'' شرجیل نے کہا۔

''ابھی بلاتی ہوں۔'' شگفتہ نے یہ کہہ کر انٹر کام کا ریسیور اٹھایا اور بٹن دبا کر بولی: ''نسرین! ہوں...... ماموں کو بھیج دو......'' تھوڑی دیر کے بعد بھورے بالوں والے ایک دھان پان شخص نے دروازہ کھول کر اندر قدم رکھا۔ لکھنوی طرز کے کرتے پائجامے میں ملبوس اس شخصیت کے ہاتھ میں گلوری کا بٹوہ لٹک رہا تھا اور باچھوں سے کتھے کی لکیر بہہ کر نیچے آرہی تھی۔

''آجائیں بٹیا......؟'' انہوں نے لکھنوی انداز میں شگفتہ سے پوچھا تھا۔

''آیئے ماموں...... آپ سے ایک کام پڑ گیا ہے۔؟'' شگفتہ نے ان کی حالت پر مسکراتے ہوئے کہا۔

''ہم حاضر ہیں بٹیا' بولو' کیا کام ہے؟'' انہوں نے بٹوہ کھول کر ایک گلوری نکالی اور اپنے کلے میں دبالی۔

''آپ بیٹھیں' میں بتاتا ہوں آپ کو۔'' شرجیل کے اپنے قریب رکھی کرسی ان کی طرف کھسکاتے ہوئے کہا۔

ماموں کے بیٹھنے کے بعد وہ آہستہ آہستہ کچھ بتانے لگا اور وہ اس کی بات پر سر ہلانے لگے۔



سٹی کورٹ میں حسب معمول رش تھا جگہ جگہ مختلف وکیل سیاہ کوٹ پہنے ہوئے یا تو ایک جگہ سے دوسری جگہ آجا رہے تھے' یا مختلف ٹولیوں کی شکل میں گپ میں مصروف تھے۔

مختلف علاقوں کے کٹہروں میں مجرمان اور گواہان سے بیان لیے جارہے تھے۔ لوگوں اور مجرموں اور ملزمان کی آمد کا سلسلہ جاری تھا۔ پولیس والے مختلف لوگوں کو سوزوکی یا ٹیکسی میں ہتھکڑیاں لگائے لے کر آرہے تھے اور متعلقہ عدالتوں تک لے جارہے تھے۔

عدالت نمبر چار کے سامنے دیگر عدالتوں کی بہ نسبت زیادہ رش تھا۔ یہاں تین روز قبل گرفتار کیے جانے

والے ملزم سلمان کو جج کے سامنے پیش کیا گیا تھا۔
ایک طرف کٹہرے میں سلمان کھڑا تھا' اس کی حالت دیکھنے سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس پر گزشتہ دو روز میں بے تحاشا تشدد کیا گیا ہے۔
وکلا کی میز پر ملزم سلمان کی جانب سے شرجیل یار خاں نے وکالت نامہ جج کے سامنے پیش کر دیا تھا۔ کلفٹن تھانے کا ایس آئی بشیر اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ عدالت میں موجود تھا۔ اس نے ایف آئی آر اور ملزم کا اقرار نامہ جج کو پیش کر دیا تھا۔ اس وقت عدالت نمبر چار میں جج محمود حسین شاہ انہی کاغذات کا مطالعہ کر رہے تھے کہ ان کے سامنے ایک لمبا چوڑا شخص آ کھڑا ہوا۔ حلیے کے علاوہ اطوار سے بھی وہ وکیل ہی لگ رہا تھا۔
محمود حسین شاہ نے سر اٹھایا اور سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔
''میں معزز عدالت کے سامنے ملزم سلمان کی طرف سے وکالت نامہ پیش کرنا چاہتا ہوں۔'' اس نے کہا۔
''لیکن...... یہ کیسے ممکن ہے؟'' جج نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔
''کیا مطلب یور آنر؟'' آنے والے وکیل نے بھی حیرت کا اظہار کیا تھا۔
''یہی کہ ایک ملزم کی طرف سے دو وکیل کیسے ہو سکتے ہیں؟'' محمود حسین شاہ نے کہا۔
''دوسرا کون؟ میں سمجھا نہیں یور آنر۔'' اس کی حیرت بدستور تھی۔
''شرجیل یار خاں نے ملزم سلمان کی طرف سے وکالت نامہ داخل کیا ہے۔'' انہوں نے بتایا۔
''وہ جعلی ہوگا...... یور آنر...... مجھے خود سلمان نے نامزد کیا ہے...... آپ خود ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔'' اس نے اپنا وکالت نامہ ان کی طرف بڑھا دیا۔
شرجیل جو کرسی پر بیٹھا تھا' اٹھ کھڑا ہوا' اس کے سامنے آ کر اس نے جج کی طرف دیکھا اور بولا۔
''میں معزز عدالت سے درخواست کروں گا کہ وہ وکیل صاحب کی تعریف دریافت کرے۔''
''طارق محمود مغل...... میں سلمان کی طرف سے اصل اور حقیقی وکیل ہوں۔'' طارق محمود مغل نے طنزیہ مسکراہٹ سے شرجیل کی طرف دیکھا تھا۔
''عدالت ایک گھنٹے کے لیے برخاست کی جاتی ہے۔'' محمود حسین شاہ نے تذبذب کے عالم میں کہا اور اپنی کرسی سے اٹھ کر پچھلی جانب بنے ہوئے چیمبر میں چلے گئے۔

تھوڑی دیر کے بعد انہوں نے گھنٹی بجا کر اپنے سیکریٹری کو بلایا اور ان دونوں وکلا کو اپنے چیمبر میں بلا لیا۔

''بیٹھیں......'' محمود حسین شاہ نے ان دونوں کے آنے کے بعد انہیں اپنے سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

''جی طارق صاحب......'' انہوں نے طارق محمود مغل کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ آپ بتائیے کہ ایک ملزم کی جانب سے دو وکلا کیسے ہو سکتے ہیں' اس سے قبل ایسا کوئی واقعہ دیکھنے یا سننے میں نہیں آیا......اصل حقیقت کیا ہے؟''

''یہ تو میرے دوست شرجیل یار خاں ہی بہتر بتا سکتے ہیں' ان کا کیا مفاد وابستہ ہے اس سلمان سے......'' طارق محمود نے مسکراتے ہوئے شرجیل کی طرف دیکھا تھا۔

''مجھے ملزم کی والدہ نے نامزد کیا ہے' میرے وکالت نامے میں لکھا ہوا ہے۔'' طارق مغل کی طنزیہ مسکراہٹ کو دیکھ کر شرجیل کا پارہ چڑھ گیا تھا' اس نے اپنے جوش پر بمشکل قابو پایا تھا۔

''اور میری خدمات خود ملزم سلمان نے حاصل کی ہیں۔ آپ وکالت نامہ ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔'' طارق محمود مغل نے جواب دیا تھا' اس مرتبہ اس کا لہجہ پرسکون تھا۔

''مسٹر شرجیل......آپ قانون کی رو سے یہ مقدمہ نہیں لڑ سکتے کیونکہ طارق صاحب کو خود ملزم نے نامزد کیا ہے' لہٰذا آپ اپنا وکالت نامہ واپس لے سکتے ہیں۔'' جج نے کچھ سوچنے کے بعد حتمی فیصلہ سنا دیا۔

''او کے یور آنرز اینڈ گلیڈ ٹو میٹ یو مسٹر طارق محمود مغل۔'' شرجیل خاموشی سے اُٹھ گیا اور چیمبر سے باہر آ گیا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ لاشاری اور حاکم خاں نے اپنے مطلب کے لیے اس وکیل کی خدمات حاصل کی تھیں۔ اسے کل رات ہی شوکت نے اس خدشے سے آگاہ کر دیا تھا اور کہا تھا کہ اگر ایسا ہو تو اسے کیا کرنا ہے۔

اسی وجہ سے وہ چیمبر سے باہر آ گیا تھا اور اب اسے اپنا کھیل شروع کرنا تھا۔ وہ باہر آ کر سرکاری وکیل کے پاس آ کر بیٹھ گیا جو اب تک اپنی کرسی پر بیٹھا جج کی آمد کا منتظر تھا۔



''میرے خیال میں اب تفصیل سے ساری معلومات کا تبادلہ کر لیا جائے تاکہ آئندہ کا لائحہ عمل ترتیب دیا جا سکے۔'' شگفتہ نے اپنے سامنے بیٹھے تینوں افراد سے کہا۔

یہ چاروں اس وقت مددگار لمیٹڈ کے دفتر میں موجود تھے۔

''پہلے آپ بتایئے ماموں...... آپ نے کیا معلومات حاصل کی ہیں؟'' شگفتہ نے بھورے ماموں سے مخاطب ہو کر کہا۔

''سلمان کے والد نور ٹیکسٹائل مل میں کام کرتے تھے۔'' ماموں نے تفصیل بیان کرتے ہوئے کہنا شروع کیا: ''پانچ سال قبل سڑک کے کنارے ان پر دل کا دورہ پڑا اور وہ موقع پر ہی جاں بحق ہو گئے۔ ان کے بعد سلمان نے کچھ عرصہ وہاں کام کیا۔ حالات خراب ہونے کے بعد کئی ملازمین کی چھانٹی کر دی گئی جس میں سلمان بھی شامل تھا' پھر اس نے مختلف جگہوں پر کام کیا' ہم نے سب جگہوں پر جا کر معلومات حاصل کی ہیں...... وہ نہ صرف محنتی تھا بلکہ ایماندار بھی تھا۔ مسلسل تلاش کے بعد جب اسے کہیں کام نہ ملا تو اس نے راہ زنی کی واردات کی اور اس کے بعد سے وہ یہی کام کر رہا تھا۔'' یہ رپورٹ مختصر لیکن جامع تھی۔

''اور علاقے میں اس کی کیا پوزیشن ہے؟'' شگفتہ نے پوچھا۔

''علاقے کے لوگوں کو اس کی گرفتاری کے بعد معلوم ہوا کہ وہ کیا کام کرتا رہا ہے۔ پورے محلے میں وہ سب کی عزت کرتا تھا' لوگوں کے کام بھی آتا تھا بلکہ اس نے پچھلے رمضان میں محلے کے دو غریب گھرانوں کی کافی مدد کی اور ایک صاحب کی بیٹی کی شادی کے سلسلے میں بھی سامان دیا تھا۔''

''ہوں......'' شگفتہ نے ہنکارا بھرا۔ اس کا مطلب ہے کہ اس میں اچھائی کے جراثیم موجود ہیں' بہر حال وہ مجرم ہے...... لیکن اسے برائیوں کی دلدل میں جانے سے بچانا ہمارا فرض ہے۔''

''شرجیل' تم کیا معلوم کر سکے ہو اب تک۔؟''

شگفتہ نے اب اپنا رخ اس کی طرف کر لیا تھا۔

''طارق محمود مغل نے بہت کوشش کی تھی کہ پہلی پیشی پر ہی کس طرح سلمان کی ضمانت کرا لے' لیکن اب دس دن بعد کی پیشی کے بعد اس کی ضمانت شاید ہو جائے' اس سے قبل ممکن نہیں ہے اب جو کچھ بھی ہمیں کرنا ہے' وہ انہی دس دنوں میں کرنا ہے۔'' شرجیل نے بتایا۔

''جی شوکت احمد صدیقی...... کیا کہتے ہیں آپ اس معاملے میں' کیا تیر مارا ہے؟'' شرجیل نے شوکت کی طرف دیکھا۔

''ہمیں فی الحال حاکم خان کو چھوڑنا ہوگا' وہ بہت اونچی چیز ہے۔ اگر ہم نے اس کو چھیڑ دیا تو یہ گیم بہت لمبا

ہوجائے گا۔اس لیے اس سے کسی مرحلے پر ٹکر بھی نہیں لینی۔ وہ بہت چالاک شخص ہے' بہت بڑا پلانر ہے' لہٰذا اس کے لیے بہت مضبوط پلاننگ کی ضرورت ہے۔ سلمان ایک معصوم شخص ہے' اگر وہ حاکم خان کے آدمیوں کے ہتھے چڑھ گیا تو کچھ عرصے بعد ایک بڑا مجرم بن کر سامنے آئے گا۔اس سے اپنے مفادات حاصل کرنے کے بعد اس سے آسانی سے چھٹکارا بھی حاصل کرلیا جائے گا لیکن اس طرح ایک پورا گھر تباہ ہوجائے گا۔اب ہمیں سلمان سے مل کر یہ معلوم کرنا ہے کہ اگر وہ اپنی آئندہ زندگی میں تائب ہوجائے تو اس کے لیے ایک روشن مستقبل موجود ہے' ہم اسے سرمایہ دار تو نہیں بنا سکتے' لیکن ایک اچھا شہری بننے میں مدد کرسکتے ہیں۔اس کے ساتھ ساتھ لاشاری کا بھی بندوبست کرنا ہوگا' وہ ایک اہم کردار ہے ایسے تمام معاملات میں ملوث ہے۔اس کے لیے شگفتہ کو میدان عمل میں آنا ہوگا۔''

وہ چاروں سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔



سلمان جس وقت جیل کے کمرے میں دو سپاہیوں کے ساتھ داخل ہوا تو وہاں طارق محمود مغل پہلے سے ایک کرسی پر بیٹھا تھا۔جیلر شاید کسی کام سے گیا ہوا تھا کیونکہ اس کمرے میں صرف طارق تھا۔اس نے اشارے سے سلمان کو اپنے قریب پڑی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

''جی وکیل صاحب......؟'' سلمان قدرے مودب ہوکر بیٹھا تھا۔

''میں نے تمہاری ضمانت کے کاغذات جمع کروائے ہیں' اگلی پیشی پر تمہاری ضمانت ہوجائے گی۔حاکم خان کو تو شاید تم جانتے ہی ہو' انہیں تم جیسے نوجوانوں سے ہمدردی ہے' تمہاری ضمانت ہوجائے تو تم ان کے منیجر سے مل لینا' میں تمہیں ان کا پتا دے دوں گا۔''

''میں بہت شکر گزار ہوں وکیل صاحب! اگر مجبوریاں نہ ہوتیں اور مجھے کوئی کام مل جاتا تو میں ہرگز ایسا کام نہ کرتا' لیکن مجھے ٹھوکریں کھانے کے بعد معلوم ہوا کہ یہاں تو کوئی ہمدردی بھی نہیں کرتا' جب تک کسی کو کوئی غرض نہ ہو...... بہرحال میں اب بھی چاہتا ہوں کہ عزت سے زندگی بسر کروں' بس مجھے موقع ملنا چاہیے۔'' کچھ دیر توقف کے بعد اس نے دوبارہ کہا: ''میں حاکم خان صاحب کے لیے سب کچھ کرنے کو تیار ہوں' انہوں نے مجھ سے ہمدردی کی ہے۔''

''کوئی پریشانی یا کوئی مسئلہ تو نہیں ہے؟'' طارق نے اس سے دریافت کیا۔
''جی نہیں......کوئی پریشانی نہیں ہے......میں ماں سے ملنا چاہتا تھا لیکن شاید وہ مجھ سے ملنا نہیں چاہتی...... بہر حال میں باہر آجاؤں تو ماں کو بھی منالوں گا۔'' اس کی آواز رندھ گئی تھی۔
''ٹھیک ہے سلمان! میں چلتا ہوں' بس یہی باتیں بتانے کے لیے میں خاص طور پر تمہارے پاس آیا تھا۔'' یہ گویا اشارہ تھا کہ وہ جا سکتا ہے۔ سلمان اُٹھا اور سلام کرتا ہوا دروازے سے باہر نکل گیا' جہاں اسے بیرک تک لے جانے کے لیے وہ دونوں سپاہی کھڑے تھے۔
طارق محمود وہاں کافی دیر تک بیٹھا تھا' اس نے جیلر سے ملنے کے بعد اس سے چند باتیں کی تھیں اور پھر وہاں سے رخصت ہو گیا تھا۔
اس کے جانے کے کوئی ایک گھنٹے بعد جیل کے کمرے میں ایک خوبصورت لڑکی، ایک نوجوان اور ایک بوڑھی خاتون داخل ہوئی تھیں۔ جیلر ان کی آمد پر اُٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا کیونکہ اوپر سے ہدایت ملی تھی کہ ان سے بھرپور تعاون کیا جائے کیونکہ یہ سرکاری اہمیت کے حامل ہیں۔ جیلر سے جو خدمت ہو سکتی تھی وہ کم تھی' وہ ان کے آگے بچھا جا رہا تھا کیونکہ ان کی سفارش ایک بااثر شخصیت نے خاصی طور پر کی تھی۔
ان کے آنے کے کچھ دیر بعد ہی دو سپاہی سلمان کو پھر لے کر جیلر کے کمرے میں داخل ہوئے تھے۔
سلمان نے اندر داخل ہوتے ہی سب سے پہلے بوڑھی خاتون کی طرف دیکھا تھا اور ''امی'' کہہ کر ان سے لپٹ گیا تھا۔
جب وہ ان تینوں کے سامنے بیٹھا تو اس کی والدہ نے اپنے ساتھ آنے والوں کا تعارف کرایا تھا۔ لڑکی کا نام شگفتہ جمالی تھا جبکہ نوجوان کو وہ جانتا تھا۔ عدالت میں وہ وکیل کی حیثیت سے اس کے سامنے آچکا تھا جس کا نام شرجیل یار خاں تھا۔
ڈیڑھ گھنٹے کے بعد جب یہ لوگ واپس گئے تو خاصے مطمئن تھے جبکہ سلمان کے چہرے پر فکر و تردد کے آثار تھے۔



وہ شخص آرام کرسی پر بیٹھا ایک موٹی سی کتاب کے مطالعے میں منہمک تھا۔اس کے سامنے میز پر بھی ڈھیروں کتابیں موجود تھیں۔

اس شخص نے اپنے ہاتھ میں موجود کتاب میں کاغذ کا ایک پرزہ لگا کر بند کیا اور میز پر موجود دوسری کتاب اُٹھائی'ابھی اس نے اس کتاب کی ورق گردانی شروع ہی کی تھی کہ میز پر رکھے موبائل فون کی گھنٹی بجنی شروع ہوگئی۔

''جی بول رہا ہوں......'' اس نے موبائل کان سے لگا کر دوسری جانب سے بولنے والے کے جواب میں کہا۔

''جی سر......میں پہچان گیا آپ کو'فرمایئے'' اس نے کچھ سننے کے بعد کہا۔

''جی ہاں......لیکن سر......جی......کل ہے......لیکن یہ کیسے ممکن ہے......کل تو دوسری پیشی ہے......آپ تو جانتے ہی ہیں کہ......''

وہ رک گیا دوسری جانب سے کافی دیر تک اسے کچھ کہا جاتا رہا اور وہ ''جی......جی ہاں......'' کہتا رہا۔

''جی ہاں......یہ ممکن ہے......میں ابھی اس کیس کے متعلق ریڈنگ کرتا ہوں......جی ہاں......میں سمجھ گیا۔ آپ بے فکر رہیں......آپ تو جانتے ہی ہیں کہ میں قانون کی بالادستی کے لیے کام کرتا ہوں......جی ہاں......میں سب سمجھتا ہوں......بے فکر رہیں''

اس نے کچھ دیر مزید بات کرنے کے بعد فون رکھ دیا۔اس کے چہرے پر حیرانی کے ساتھ ساتھ پریشانی بھی تھی۔اس کی زندگی میں آج تک ایسا نہیں ہوا تھا۔



سٹی کورٹ میں حسب معمول لوگوں اور وکلا کا رش تھا۔دوسری عدالتوں کی طرح عدالت نمبر چار میں بھی اچھے خاصے لوگ تھے۔جج محمود حسین شاہ کرسی پر بیٹھے تھے جبکہ ان کے سامنے وکلا کی میز پر طارق محمود مغل اور سرکاری وکیل کارروائی کے آغاز کا انتظار کررہے تھے۔حاضرین میں کلفٹن تھانے کے ایس آئی شبیر اور تین سپاہیوں کے علاوہ شگفتہ،شرجیل،سلمان کی والدہ،بہن گڑیا اور محلے کے چند افراد بیٹھے تھے۔

تھوڑی ہی دیر کے بعد کارروائی شروع ہوگئی۔پہلے گواہان کے بیانات لیے گئے'جن میں ایس آئی شبیر اور دو سپاہیوں کے علاوہ وہ خاتون بھی شامل تھیں جن سے سلمان نے پرس چھینا تھا'اس کے بعد وکیل نے دلائل دیے۔سرکاری وکیل نے عدالت سے درخواست کی تھی کہ ملزم چونکہ مجرم ثابت ہوچکا تھا'لہٰذا اسے قانونی

تقاضوں کے مطابق سزا دی جائے' جبکہ طارق محمود مغل نے عدالت سے سلمان کی ضمانت جاری کرنے کی درخواست کی تھی۔

جج محمود حسین شاہ نے سب کے بیانات سننے کے بعد ہتھوڑا بجا کر حاضرین کو چپ رہنے کا کہا اور بولے:

''عدالت ملزم کے اقرار اور گواہوں کے بیانات سننے کے بعد اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ ملزم نے بے شک اس راہ کو مجبوری کی وجہ سے اپنایا لیکن چونکہ جرائم کا ارتکاب کیا ہے' لہٰذا انسانی ہمدردی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے دو سال قید اور پچاس ہزار جرمانے کی سزا سنائی جاتی ہے۔ جرمانے کی عدم ادائیگی پر مزید ایک سال قید بھگتنا ہوگی۔'' انہوں نے فیصلہ سنایا اور فیصلے پر اپنے دستخط کر دیے۔

شرجیل اور شگفتہ خاص طور پر طارق محمود مغل اور اس کے ساتھ آئے ہوئے ایک لحیم شحیم شخص کو دیکھ رہے تھے۔ ان کے چہروں پر حیرت کے آثار تھے۔

عدالتی تاریخ میں یہ پہلا واقعہ تھا کہ کسی مجرم کو صرف دوسری پیشی پر ہی سزا سنا دی جائے' حالانکہ دیوانی مقدمات کو حل ہونے میں ایک مدت لگتی تھی۔ بعض اوقات تو جو گواہان پہلے موجود ہوا کرتے تھے' آہستہ آہستہ غائب ہوتے رہتے تھے اور اس طرح کچھ عرصے بعد اس مقدمے کی نوعیت ہی تبدیل ہو جایا کرتی تھی لیکن اس مقدمے میں ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔ دوسری کے بعد تیسری پیشی کی نوبت ہی نہ آئی تھی۔

فیصلے کے بعد جیسے ہی جج محمود حسین شاہ اُٹھ کر اپنے چیمبر میں گئے۔ جیل خانے کے سپاہی سلمان کو کٹہرے سے اپنے ساتھ لے گئے جبکہ طارق محمود اور اس کا ساتھی اُٹھ کر عدالت سے باہر نکل گئے۔

شگفتہ نے ہاجرہ خاتون کے ایک ہاتھ کو پکڑ کر اپنی گود میں رکھا ہوا تھا۔ وہ بھی دوسرے حاضرین کے ساتھ عدالت سے باہر آئے۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ ہاجرہ خاتون کے گھر کی طرف جا رہے تھے۔



وہی جیلر کا کمرہ تھا جہاں ایک مرتبہ پہلے بھی سلمان اپنی والدہ اور ان لوگوں سے ملا تھا۔ آج اس کی بہن بھی ان کے ساتھ تھی۔

جیسے ہی سلمان کمرے میں داخل ہوا' اس کی بہن گڑیا دوڑ کر اس سے لپٹ گئی۔ سلمان اور اس کی والدہ کی آنکھیں بھی بھر آئیں تھیں۔

’’بیٹھو سلمان...... ‘‘ شرجیل نے اسے اپنے سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

’’دیکھو سلمان! ایک بات یاد رکھنا۔ جرم کی سزا تو بہر حال بھگتنا پڑتی ہے' لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ آئندہ کی زندگی داغدار ہو جاتی ہے...... نہیں...... ابھی معاشرہ اتنا نہیں بگڑا ہے۔ اگر کوئی اپنی زندگی کو سنوارنا چاہے تو اس کے لیے راہیں آج بھی کھلی ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ تم جب دو سال بعد باہر آؤ تو ویسے ہی سلمان بن جاؤ' جیسا کہ پہلے تم تھے۔‘‘ شگفتہ اسے سمجھاتے ہوئے کہہ رہی تھی ’’تمہاری ماں اور بہن اب ہماری ذمہ داری ہیں۔ اگر تم ہماری ہدایت پر عمل نہ کرتے تو ضمانت پر رہا ہونے کے بعد تم سے جو کام لیے جاتے اور جس طرح تمہیں استعمال کیا جاتا' وہ تمہیں ایک پختہ مجرم بنا دیتا پھر تمہارا انجام بھی بھیانک ہی ہوتا...... اور ایک بات یاد رکھنا سلمان! ہمارے ہاں کی جیلیں لوگوں کو بگاڑتی زیادہ اور سدھارتی کم ہیں۔ جن لوگوں کے خمیر میں فرق اور ضمیر میں کھوٹ ہوتا ہے' وہ یہاں سے استاد بن کر نکلتے ہیں' ان کا کوئی مستقبل نہیں ہوتا' ان کا انجام اتنا بھیانک ہوتا ہے کہ روح تک کانپ جاتی ہے' تمہارے سامنے دونوں طرح کا مستقبل ہے' جس کا چاہو انتخاب کرلو۔‘‘ شگفتہ نے سلمان کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کو دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

’’لیکن میں کیسے یقین کرلوں کہ اب میرے ساتھ ایسا نہیں ہوگا...... یا آپ لوگ ایسے نہیں ہیں؟‘‘ سلمان کے لب و لہجے سے شک کا اظہار ہو رہا تھا۔

’’تم ٹھیک سوچ رہے ہو سلمان...... ‘‘ شرجیل نے کہا: ’’تمہاری یہی سوچ تمہارے لیے راہنمائی فراہم کرے گی۔ تم ایک باشعور آدمی ہو...... اور کوئی بھی شخص جو فہم رکھتا ہو' اچھے اور برے کی تمیز بھی رکھتا ہے۔ یوں سمجھو کہ تم آج سے ملازم ہو...... دو سال تک تمہاری والدہ اور بہن کو باقاعدگی سے ہر ماہ تمہاری تنخواہ ملتی رہے گی۔ جب تم رہا ہو جاؤ گے تو کام پر چلے جانا...... یہ رقم ہر ماہ تمہاری تنخواہ سے تھوڑی تھوڑی کر کے اقساط میں منہا ہوا کرے گی۔ اس طرح یہ ایک طرح سے قرض ہوگا جو تمہیں ادا کرنا ہے۔‘‘

’’اور...... ایک فرض بھی ہے...... جو تمہیں ادا کرنا ہے۔‘‘ شگفتہ نے مسکراتے ہوئے گڑیا کے گال تھپتھپائے۔

’’میں آپ لوگوں کا احسان مند ہوں...... بس ایک گزارش کروں گا کہ میری ماں اور بہن کا خیال رکھیے گا۔‘‘ سلمان نے ڈبڈبائی آنکھوں سے شرجیل اور شگفتہ کی طرف دیکھا تھا۔

''بے فکر رہو سلمان...... جیسے یہ تمہاری ماں ہیں' بالکل اسی طرح یہ ہماری بھی ماں ہیں اور گڑیا ہماری بہن۔'' شگفتہ نے کہا تھا۔

''یہ دو سال جلدی کٹ جائیں گے......اور ہم تم سے ملنے بھی آیا کریں گے...... بے فکر رہو۔'' شرجیل نے کہا۔

ایک گھنٹے تک سلمان اپنی ماں اور بہن سے باتیں کرتا رہا اور جب وہ کمرے سے باہر جا رہا تھا تو اس کی آنکھوں میں جینے کا حوصلہ اور اُمنگ تھی اور چہرے سے اطمینان ظاہر ہو رہا تھا۔



رشتوں کے گرداب میں

''میں کہتا ہوں' آخر کب سدھرو گے تم......؟'' نیاز احمد خان نے گرجدار آواز میں شکیل کو ڈانٹا تھا۔ ''حد ہو چکی ہے...... میں روز روز سمجھا کر تنگ آ چکا ہوں۔''

''ابو...... میں بھی ان روز روز کی نصیحتوں سے اکتا چکا ہوں' آخر کون سا جرم کر دیا ہے میں نے......؟'' شکیل نے زچ ہو کر جواب دیا تھا۔

''بکواس نہ کرو شکیل...... تم ابو سے بات کر رہے ہو۔'' عقیل جواب تک خاموش کھڑا دیکھ رہا تھا' نے شکیل کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔

''بہت ہو گیا ہے' بھائی جان...... میں یہ گھر ہی چھوڑ کر چلا جاؤں گا...... میں اس جہنم میں نہیں رہ سکتا......'' شکیل اس وقت غصے میں تھا۔

''تم ...... بدتمیز...... تم ابھی نکل جاؤ اس گھر سے......'' نیاز صاحب کو جلال آ گیا تھا۔'' جاؤ......'' وہ دھاڑے۔

''ایک بات یاد رکھیے گا ابو......'' شکیل نے جانے کے لیے قدم بڑھا کر ایک لمحے کو رکتے ہوئے کہا۔ ''میں کبھی شکل بھی نہ دکھاؤں گا...... چاہے آپ لوگ کسی مشکل میں ہی کیوں نہ پڑ جائیں۔'' وہ تیزی سے بیرونی دروازے کی طرف بڑھا تھا۔

''سنو...... شکیل ایک منٹ سنو تو......'' عقیل اس کے پیچھے لپکا تھا۔

’’جانے دو عقیل...... اسی میں ہم لوگوں کی بھلائی ہے......‘‘ نیاز احمد خان نے گمبھیر لہجے میں کہا تھا۔

ایک سال قبل تک اچھا خاصا پرسکون گھر تھا۔ نیاز احمد خان کے ڈی اے میں ملازم تھے۔ عقیل بی اے کر چکا تھا جبکہ شکیل انٹر کے بعد مزید تعلیم جاری نہ رکھ سکا تھا۔ وجہ مالی وسائل نہیں بلکہ اس کی اپنی دلچسپی کا فقدان تھا۔ عقیل اور شکیل دن کا زیادہ وقت گھر سے باہر گزارتے تھے۔ عقیل تو مختلف اداروں میں انٹرویو کے لیے چکر لگاتا مگر شکیل چند آوارہ مزاج لڑکوں کے گروپ کے ساتھ اِدھر اُدھر وقت گزار کر شام گئے واپس آجاتا تھا۔ گھر میں ان کی ایک بہن خالدہ اور والدہ ان کی واپسی کا انتظار کرتی تھیں۔

خالدہ ابھی پڑھ رہی تھی اور میٹرک کے امتحان کی تیاریوں میں مصروف تھی۔

پھر ایک دن عقیل نے خوش خبری سنائی تھی کہ اسے ایک کمپنی میں اکاؤنٹنٹ کی نوکری مل گئی ہے۔ اس روز پہلی مرتبہ شکیل رات کو دیر سے گھر لوٹا تھا۔ تمام گھر والے پریشان تھے۔ نیاز احمد خان اور عقیل، دونوں ہی مختلف جگہوں پر اس کے متعلق معلوم کر آئے تھے مگر کسی نے بھی اس کے متعلق نہیں بتایا تھا۔ خود شکیل نے کبھی بھی اپنے ان دوستوں کا ذکر نہیں کیا تھا' جن کے پاس وہ وقت گزارا کرتا تھا۔ رات دس بجے جب شکیل گھر پہنچا تو پورے گھر میں خاموشی تھی' تمام چہرے سوالیہ نشان بنے' اسے دیکھ رہے تھے۔

’’کہاں تھے اب تک؟‘‘ نیاز احمد خان نے غصے کو ضبط کرتے ہوئے اس سے پوچھا تھا۔

’’دوستوں کے ساتھ پکنک پر چلا گیا تھا......!‘‘ شکیل نے اس طرح بتایا گویا کوئی بات ہی نہ ہو۔

’’آئندہ گھر سے باہر اتنی دیر تک نہ رہنا......‘‘ انہوں نے گویا وارننگ دی تھی۔

’’کیا کروں میں...... دوستوں کے ساتھ ہی تو رہتا ہوں۔‘‘ شکیل نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا تھا۔

’’کوئی کام تلاش کرو...... کب تک آوارہ گردی کرو گے...... یہ دوستیاں کام نہیں آئیں گی...... پڑھنا تو تم نے ہے نہیں......‘‘ اس کی والدہ نے پہلی مرتبہ گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا تھا۔

’’چھوڑیں امی...... پہلے کھانا کھالیں...... پھر سمجھالیں گے اسے۔‘‘ عقیل نے معاملے کو ٹھنڈا کرنے کی غرض سے کہا۔

’’آپ لوگ کھالیں...... میں کھانا کھا کر آیا ہوں۔‘‘ شکیل نے کہا اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔

’’حد ہوگئی نافرمانی اور بدتمیزی کی......‘‘ نیاز احمد خان بڑبڑائے۔

"ابو...... میں اسے سمجھا دوں گا...... چلیں پہلے کھانا کھا لیتے ہیں۔" عقیل نے کہا پھر اپنی والدہ سے بولا۔
"چلیں امی...... آپ کھانا لگوائیں۔"

اگلے روز سے عقیل کو اپنی ملازمت پر جانا تھا' اس لیے وہ صبح سویرے اُٹھا اور تیار ہو کر اپنے والد کے ساتھ ساتھ کام پر نکل گیا۔

اس روز شکیل دوپہر تک گھر پر ہی رہا تھا۔ دوپہر کے کھانے کے بعد وہ گھر سے نکلا تو پھر دیر سے گھر لوٹا تھا۔ رات کے کھانے پر شکیل بھی دستر خوان پر موجود تھا۔ سب نے خاموشی سے کھانا کھایا اور اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔

عقیل کچھ دیر بعد شکیل کے کمرے میں موجود تھا۔

"شکیل...... مجھے تم سے کچھ باتیں کرنا ہیں۔" عقیل نے اس کے پلنگ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"جی بھائی جان...... کہیے......" شکیل اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

"شکیل...... کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم اپنی آوارہ گردیاں ترک کر دو...... یا تو پڑھائی شروع کر دو یا پھر کسی کام کو تلاش کرو......" عقیل نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے نرم لہجے میں کہا۔

"بھائی جان...... یہاں ہمارے ملک میں...... ہمارے معاشرے میں دو ہی چیزیں کام آتی ہیں...... دولت اور سفارش...... جتنی اچھی ساکھ اور حیثیت ہوگی' اتنی ہی اچھی ملازمت بھی ملے گی...... یہاں تعلیم وغیرہ کو کوئی نہیں پوچھتا...... آپ اپنے آپ کو ہی دیکھ لیں' کون سا تیر مار لیا ہے آپ نے...... اتنے دھکے کھانے کے بعد کیا ملا...... کیا تنخواہ ہوگی آپ کی...... ابو کو اتنا عرصہ ہو گیا ہے' کام کرتے ہوئے' کون سی ترقیاں مل گئی ہیں انہیں...... میں کوئی بڑا کام کرنا چاہتا ہوں' کوئی ایسا کام کہ ہماری ساری تکالیف دور ہو جائیں۔" شکیل کے لہجے سے بغاوت کی بو آ رہی تھی۔

"کیا چوری اور ڈکیتیاں کرو گے؟" عقیل کو اس کا لہجہ ناگوار گزرا تھا۔

"ضروری نہیں ہے بھائی جان...... بس آپ دیکھتے رہیے...... میں بہت جلد آپ کو خوشخبری سناؤں گا۔" شکیل نے کہا تھا۔

عقیل اس سے بحث کیے بغیر اُٹھ کر چلا آیا تھا۔

اگلے روز جب وہ دفتر سے شام کو لوٹا تو اس نے اپنے والد اور والدہ کو شکیل سے ہونے والی گفتگو کے متعلق بتا دیا تھا۔ ”دیکھ لینا عقیل ...... یہ لڑکا کوئی نہ کوئی گل ضرور کھلائے گا‘ اس کی وجہ سے ہم کسی بڑی مصیبت میں پھنس جائیں گے‘ اس لیے اس کا بندوبست ضروری ہے۔“ نیاز احمد نے تمام باتیں سننے کے بعد کہا تھا۔

اس کے بعد یہ ہر دوسرے تیسرے روز کا معمول ہو گیا تھا کہ شکیل جب رات دس بجے کے بعد آتا تو گھر کی فضا مکدر ہو جاتی۔

آج تو شکیل نے حد ہی کر دی تھی۔ رات کے دو بجے تھے‘ جب اس نے گھر میں قدم رکھا تھا۔ نیاز احمد خان تو پہلے ہی اسے سمجھا سمجھا کر اکتا چکے تھے‘ آج ان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔

”تم دیکھ لینا عقیل‘ یہ لڑکا واپس ضرور آئے گا۔ جب دَر دَر کی ٹھوکریں کھائے گا ...... تو اسے آنا ہی ہو گا۔“ شکیل کے جانے کے بعد انہوں نے عقیل سے کہا تھا جبکہ بیگم نیاز رونے بیٹھ گئی تھیں‘ خالدہ انہیں چپ کرانے کی کوشش کرنے لگی تھی۔

دن گزرنے لگے ...... ایک دن ...... دو ہفتے ...... ایک ماہ ...... چھ ماہ ...... شکیل کی کوئی خیر خبر نہ ملی ...... پھر ایک روز حسب دھک سے رہ گئے ...... خبر کی نوعیت ہی کچھ ایسی تھی۔

تینوں سر جوڑے دفتر میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے چہروں سے ہی اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ کسی مسئلے پر سنجیدگی سے سوچ رہے ہیں۔

”سمجھ میں نہیں آ رہا کہ اس مسئلے میں ہم بھلا کیا کر سکتے ہیں۔“ آخر کار شوکی بولا۔

”بھئی کرنا کیا ہے ...... اس مسئلے کو حل کرنا ہے ...... آخر اس مددگار لمیٹڈ کو بنانے کا کوئی مقصد تو ہونا ہی چاہیے۔“ شرجیل نے اسے گھورتے ہوئے جواب دیا۔

”بڑے لوگوں کے مسئلے بھی عجیب ہوتے ہیں ...... آخر بیگم جمشید اخبار میں اشتہار کیوں نہیں دے دیتیں۔ ہم کہاں کہاں مارے مارے پھریں گے اس کی تلاش میں ...... کیوں ......؟“ شوکی نے ناک پر چشمہ درست کرتے ہوئے کہا۔

”اچھا بھئی ...... تم دونوں لڑو نہیں ...... میں سوچتی ہوں اس مسئلے کا حل ...... آخر مددگار لمیٹڈ کب تک یونہی خدمت کرتا رہے گا ...... اس کا بینک بیلنس بھی تو بڑھانا ہے ...... اور وہ اس طرح کے کاموں سے بڑھے گا ......

بیگم جمشید کے لیے یہ زندگی اور موت کا مسئلہ ہے۔ ہمیں اسے تلاش کرنا ہی ہوگا۔" شگفتہ نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے ان دونوں سے کہا۔

"ٹھیک ہے بھئی...... جیسی تمہاری مرضی...... پچیس ہزار کی رقم ویسے بھی معمولی نہیں ہوتی...... کہاں سے ابتدا کریں ہم لوگ......؟" شرجیل نے شگفتہ سے پوچھا۔

"اس کے گھر والوں سے معلوم کرتے ہیں۔ کیوں شوکی تمہارا کیا خیال ہے؟" شگفتہ نے شوکت سے پوچھا۔

"ارے وہ کم بخت گھر والی کے ساتھ ہی تو غائب ہوگیا ہے' رہتا بھی تو وہیں تھا بیگم جمشید کے ہاں......!" شوکی نے اپنا چشمہ اتار کر صاف کیا اور دوبارہ ناک پر جمالیا۔

"یہ بھی مسئلہ ہے...... پھر کیا کریں؟" شگفتہ نے ایک ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔

"میری نظر میں ایک شخص ایسا ہے جو یہ کام کرسکتا ہے!" شرجیل نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تو پھر جان کیوں جلا رہے ہو' بتاتے کیوں نہیں؟" شوکت نے دائیں ہاتھ کو لہراتے ہوئے کہا' جس پر شگفتہ کی ہنسی چھوٹ گئی۔

"ہم ہیں ناں بیٹا...... کیوں شرجیل میاں؟" بھورے ماموں جو کرسی پر بیٹھے اونگھ رہے تھے' اچانک سر اٹھا کر بولے۔ "ہیں...... تو کیا آپ جاگ رہے تھے؟" شرجیل نے حیرت سے کہا۔

"نہیں بیٹا...... ہم تو سو رہے تھے...... لیکن سوتے جاگتے' ہم دیکھتے اور سنتے سب کچھ ہیں...... عادت ہے ہماری۔" انہوں نے یہ کہتے ہوئے اپنے بٹوے کو کھولا اور پان کی ایک گلوری اپنے کلے میں دبالی۔

"ٹھیک ہے ماموں...... پھر یہ آپ کی ذمہ داری ہے...... اب ابھی سے اس مہم پر نکل جایئے اور اس کے متعلق معلومات حاصل کریں کہ وہ کہاں جاسکتا ہے...... کہیں ایسا تو نہیں کہ اسے اغوا کرلیا ہو کسی نے...... بیگم جمشید کا یہی خیال ہے...... ہوسکتا ہے کہ یہ خیال درست بھی ہو...... اب اس کا پتا لگانا آپ کا کام ہے۔" شگفتہ نے اب جو سانس بھرا، اس سے اطمینان کا اظہار ہوتا تھا۔

"تم بے فکر رہو بیٹا......!" انہوں نے کہا: "ہم تمہیں پوری رپورٹ دیں گے۔"

"او کے ماموں...... آپ ابھی سے مہم پر نکل جایئے...... بیگم جمشید نے ہمیں معاوضہ پیشگی ادا کردیا ہے لہٰذا اس کام کو جتنی جلد ہوسکے نمٹانا ہے...... خاص طور پر پندرہ تاریخ سے پہلے پہلے...... کیونکہ ان کے ہاں پندرہ تاریخ

کو پارٹی ہے۔'' شگفتہ نے انہیں تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔

گزشتہ روز بیگم جمشید نے مددگار لمیٹڈ کے دفتر میں فون کیا تھا۔ اس وقت شگفتہ دفتر میں اکیلی تھی۔ لہٰذا فون بھی اسی نے اُٹھایا تھا۔

''ہیلو...... مددگار لمیٹڈ؟'' دوسری جانب سے پوچھا گیا۔ ''آپ کون بول رہی ہیں؟'' شگفتہ نے اس بات کی تصدیق کیے بغیر ہی دریافت کیا۔ اس لیے کہ دفتر کے باہر جو تختی آویزاں تھی' اس پر شگفتہ انٹر پرائز رلکھا تھا۔ بہت کم لوگوں کو معلوم تھا کہ مددگار لمیٹڈ کا دفتر بھی یہی ہے۔ ایک مخصوص حلقے میں یہ خبر پھیلائی گئی تھی کہ مددگار لمیٹڈ کے نام سے ایک ادارہ وجود میں آیا ہے جو لوگوں کی ہر طرح کی پریشانیوں کا حل تلاش کرے گا' خواہ یہ پریشانیاں ذاتی ہوں یا اجتماعی...... اس کا حل قانونی طور پر نکلتا ہو یا کسی دوسرے طریقے سے...... بس ہر مسئلے کے حل کے لیے پچیس ہزار روپے مخصوص کر دیے گئے تھے' اس رقم کی ادائیگی کے بعد اس پریشانی کا حل تلاش کرنا مددگار لمیٹڈ کا کام تھا۔ شرط یہ تھی کہ ادارے تک پہنچنے کے لیے کسی کا حوالہ ضروری تھا ورنہ فون پر انکار کر کے معذرت کر لی جاتی تھی۔

''میں بیگم جمشید بول رہی ہوں...... مجھے صوفیہ امام نے آپ کے متعلق بتایا تھا۔'' انہوں نے حوالہ دیتے ہوئے کہا۔ ''جی بیگم جمشید...... فرمایئے...... ہم کیا خدمت کر سکتے ہیں آپ کی......؟'' شگفتہ نے حوالہ سننے کے بعد اطمینان کا اظہار کیا تھا۔

''کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ آپ مجھ سے مل لیں تاکہ میں آپ کو اپنی پریشانی بتا سکوں؟'' دوسری جانب سے بیگم جمشید نے جس لہجے میں کہا تھا اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کسی بڑی الجھن میں پھنس گئی ہیں۔

''دیکھیں بیگم جمشید! جب تک معاملے کی نوعیت نہ پتا چلے' ہم اپنے نمائندے کو نہیں بھیج سکتے...... اس کے علاوہ آپ کو ہماری شرائط کا بھی علم ہوگا......؟'' شگفتہ نے بالکل کھرے کاروباری انداز میں کہا تھا۔

''جی ہاں! میں جانتی ہوں...... آپ اپنے نمائندے کو فوراً میرے پاس بھیج دیں...... میں آپ کا معاوضہ پیشگی ادا کرنے کو تیار ہوں۔'' بیگم جمشید نے کہا تھا۔

''بہتر ہے...... آپ اپنا پتا لکھوا دیں...... ہماری نمائندہ شگفتہ آپ کے پاس پہنچ رہی ہے۔'' شگفتہ نے کہا اور دوسری جانب سے بتایا جانے والا پتا نوٹ کرنے لگی۔ جس وقت وہ اپنے سامنے پڑے پیڈ پر پتا لکھ رہی تھی'

اس کی آنکھوں میں حیرت صاف پڑھی جا سکتی تھی۔

''آپ کی نمائندہ کب تک پہنچ جائے گی؟'' بیگم جمشید کے لہجے سے بے چینی مترشح تھی۔

''ایک گھنٹے میں......!''

''میں انتظار کر رہی ہوں۔'' اس کے بعد فون رکھ دیا گیا تھا۔



آٹھویں منزل پر واقع یہ ایک خوبصورت سا فلیٹ تھا۔ وہ پانچ نوجوان تھے جو اس فلیٹ کے بڑے سے ہال نما ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے تھے۔

''ہر کام میں رسک تو ہوتا ہے...... پھر یہ تو ایک معمولی سا کام ہے۔ اس کا معاوضہ بھی شاندار ہے...... ایک لاکھ روپے کم نہیں ہوتے ندیم......!'' ایک نوجوان نے اپنے سامنے بیٹھے ہوئے دوسرے نوجوان کو مخاطب کیا۔

''اگر رسک نہیں لیں گے تو اتنی بڑی رقم بھی نہیں ملے گی...... پیسہ کمانا آسان نہیں ہوتا۔'' ندیم نے اس کی بات کا جواب دیتے ہوئے اپنے بقیہ ساتھیوں کی طرف دیکھا تھا۔

''دیکھو بھی رضوان...... میں اس کے حق میں نہیں ہوں...... تم لوگوں نے تو مجھے کہا تھا کہ ہم کہیں باہر جانے کی کوشش کریں گے...... اگر مجھے معلوم ہوتا کہ اس طرح کا کام کرنا پڑے گا تو میں کبھی بھی گھر چھوڑ کر تم لوگوں کے پاس نہ آتا......'' یہ شکیل تھا جو اپنے والد سے جھگڑا کرنے کے بعد اپنے دوستوں کے ہاں چلا آیا تھا۔

اس کے دوستوں نے کہا تھا کہ وہ ان کے ساتھ بیرون ملک چلے' جہاں اسے نہ صرف اچھی ملازمت ملے گی' بلکہ بے حد معقول معاوضہ بھی...... وہ بھی اسی کی طرح معاشرے سے متنفر تھے...... موجودہ نظام کے مخالف...... ان کی سوچ بھی باغیانہ تھی۔ وہ اپنے گھر کو خیر باد کہہ کر ان کے پاس چلا آیا تھا۔ ایک ہفتے تک تو اس نے سب کے ساتھ مل کر خوب عیش کیے...... ایک دن وہ چاروں غائب ہو گئے۔ شکیل رات گئے تک ان کا انتظار کرتا رہا۔ فلیٹ میں فون بھی نہ تھا۔ اس نے ساری رات سوتے جاگتے کاٹی تھی۔ صبح سویرے ہی وہ چاروں ہنستے مسکراتے فلیٹ میں داخل ہوئے تھے۔ ان کے ہاتھ میں بڑے بڑے بیگ تھے۔ انہوں نے وہ بیگ احتیاط سے ایک کمرے میں رکھ کر تالا لگا دیا تھا۔ چونکہ اس وقت نیند سے بری حالت تھی' اس لیے اس نے ان سے کچھ نہ پوچھا۔

دوپہر کو اس کی آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا کہ وہ چاروں بے سدھ سوئے ہوئے تھے۔ اسے بھوک محسوس

ہو رہی تھی' اس نے کچن میں جا کر فریج سے جو کچھ کھانے کو مل سکا نکالا اور کھا کر دوبارہ سو گیا۔

شام کو جب وہ جاگا تو وہ چاروں تیار ہو کر بیٹھے تھے اور شاید اس کے جاگنے کا انتظار کر رہے تھے' بہرحال وہ تیار ہوا اور ان کے ساتھ باہر نکل گیا۔ اس رات وہ کافی دیر تک گھومتے پھرتے رہے' پھر جب وہ واپس آئے تو ان کے ساتھ بہت سی کھانے پینے کی چیزوں کے علاوہ اعلیٰ قسم کے سگریٹ اور شراب کی ایک بوتل بھی تھی۔

اس رات اس نے پہلی مرتبہ ان کے اصرار پر نہ صرف سگریٹ نوشی کی تھی بلکہ شراب بھی پی تھی۔ پھر یہ تقریباً ہر دوسرے روز کا معمول بن گیا تھا۔ ہفتے میں دو مرتبہ وہ چاروں گھر سے غائب ہوتے اور جب واپس لوٹتے تو ان کے ساتھ بھرے ہوئے بیگ ہوتے تھے۔

آج انہوں نے کھل کر شکیل سے گفتگو کی تھی۔

سہیل نے اس سے کہا تھا۔

''یہ ایک معمولی سا کام ہے۔ بس پندرہ منٹ لگیں گے' اس کے بعد ایک بڑی رقم ہمارے ہاتھ میں ہوگی۔''

''لیکن کام کیا ہوگا؟'' شکیل نے تجسس سے پوچھا تھا۔ ''ایک بچے کو اغوا کرنا ہے!'' ندیم نے اس کے چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

''کیا مطلب...... یعنی تم لوگ...... یہ سب...... یقین نہیں آتا سہیل؟'' شکیل حیرت زدہ رہ گیا تھا۔

''اس میں یقین نہ کرنے والی کون سی بات ہے؟ تم کیا سمجھ رہے ہو کہ اب تک جو عیش کر رہے ہو' وہ ہمارے باپ کی جائیداد کا منافع مل رہا ہے یا ہم نے کوئی کارخانہ لگا رکھا ہے۔'' ندیم نے مضحکہ خیز انداز سے کہا تھا۔

''تو...... کیا کرتے ہو تم لوگ......'' شکیل کچھ کچھ معاملے کو سمجھ گیا تھا۔ ''کیا ڈکیتیاں کرتے ہو تم لوگ؟''

''ٹھیک سمجھے برادر...... اب تم بھی شریک ہو جاؤ...... بہت آرام کر لیا ہے تم نے...... اگر منافع میں حصہ چاہتے ہو تو ہمارے ساتھ کام کرو......'' ادریس نے جو اب تک خاموش تھا' اسے گھورتے ہوئے جواب دیا۔

''لیکن...... میں یہ سب نہیں کر سکتا۔'' شکیل نے قدرے تذبذب سے کہا۔

''کیوں...... کیا برائی ہے اس میں...... بولو......!'' قادر نے اسے ہچکچاتے ہوئے دیکھ کر کہا: ''کیا ہم چاروں یہ کام نہیں کر رہے ہیں...... اتنا عرصہ ہو گیا ہے ہمیں...... مجال ہے جو آج تک پکڑے گئے ہوں یا کسی کو شبہ بھی ہو سکا ہو......''

''وہ سب ٹھیک سہی...... لیکن میں ایسے کسی معاملے میں تمہارا ساتھ نہیں دے سکتا...... میں کل ہی کہیں چلا جاؤں گا۔'' شکیل نے حتمی لہجے میں اپنا فیصلہ سنا دیا۔

''میرے دوست صرف تم ہی نہیں ہم بھی چلیں گے......!'' ندیم نے قادر کو آنکھ مارتے ہوئے شکیل سے کہا۔

''کیا مطلب؟...... تم لوگ کہاں جاؤ گے؟'' شکیل نے حیرت سے پوچھا۔

''میں نے پانچوں کے پاسپورٹ دے رکھے ہیں...... بس ایک دو دن کی بات ہے۔ ایجنٹ کا کہنا ہے کہ شاید اسی ہفتے ہم کینیڈا کے لیے پرواز کر جائیں۔'' سہیل اور ادریس ایک لمحے کو متعجب ہوئے تھے لیکن شاید ندیم نے انہیں کوئی اشارہ کیا تھا جس کی وجہ سے انہوں نے کوئی وضاحت طلب نہیں کی۔

''وہ تو ٹھیک ہے ندیم...... یہ بچے والا معاملہ سمجھ میں نہیں آیا۔'' شکیل ابھی تک الجھن میں تھا۔

''کچھ نہیں یار...... وہ دراصل ہم مذاق کر رہے تھے تم سے......'' قادر نے ہنس کر کہا۔

''کیا...... مذاق...... اتنا بھیانک مذاق......؟'' شکیل ایک بار پھر حیرت زدہ رہ گیا تھا۔

''ہاں یار...... کیا دوستوں میں مذاق نہیں چلتا کیا؟'' ندیم نے کہا تھا۔

''چلو یار...... آرام کرتے ہیں...... میں تو چلا......!'' سہیل نے معاملے کو ختم کرنے کی غرض سے کہا اور اُٹھ گیا۔

''یار شکیل مائنڈ نہ کرنا...... اور ہاں کل تم ادریس کے ساتھ ذرا ایجنٹ کے پاس چلے جانا تاکہ صورت حال کا اندازہ ہو جائے' آخر اس نے ایک بڑی رقم لی ہے کام کرنے کے لیے......'' ندیم نے کہا اور وہ بھی سہیل کے پیچھے پیچھے کمرے سے نکل گیا۔



''جی......!'' شگفتہ نے بڑی حیرت سے 'جی' کو کھینچ کر لمبا کرتے ہوئے کہا تھا۔

''جی ہاں اور...... اب میں چاہتی ہوں کہ وہ پارٹی سے ایک روز قبل تک لازمی واپس آجائے...... ورنہ میرے لیے اتنی جلدی کوئی متبادل تلاش کرنا بے حد مشکل ہے۔'' بیگم جمشید نے فکر مند لہجے میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

یہ قیمتی آرائشی اشیاء سے سجا ہوا ایک بڑا سا ہال نما ڈرائنگ روم تھا جہاں دونوں آمنے سامنے بیٹھی ہوئی تھیں۔ درمیان میں رکھی میز پر کھانے پینے کی ڈھیر ساری چیزیں سجی ہوئی تھیں۔

شگفتہ جب جمشید ولا پہنچی تو دربان نے انٹرکام کے ذریعے اندر اطلاع کردی تھی۔

ہرے بھرے کھیت نما باغیچے سے گھری ہوئی عمارت میں وہ ایک ملازم کی رہنمائی میں پہنچی تھی۔ وہ ٹیکسی کے ذریعے آئی تھی۔ جس وقت وہ ڈرائنگ روم میں پہنچی تو بیگم جمشید غالباً اس کے انتظار میں ہوٹل رہی تھیں۔

پھر بیگم جمشید نے تفصیل سے واقعات بیان کیے تھے۔

ان کے مطابق ان کا قدیم باورچی رمضان عرف رمضو اپنی اہلیہ سمیت غائب ہوگیا تھا۔ آج سے تین روز قبل جب وہ باہر جانے کے لیے تیار ہونے لگیں تو ان کے ملازم نے بتایا کہ رمضو صبح سودا سلف لینے گیا تھا لیکن اب تک واپس نہیں آیا ہے۔ اس وقت تو وہ جلدی میں تھیں لیکن جب شام کو وہ واپس لوٹیں تو ان کی پریشانی شروع ہوگئی۔ ایسا ہرگز نہیں تھا کہ رمضو ان کے گھر سے کچھ چرا کر بھاگ گیا تھا' وہ ان کے ہاں پندرہ سال سے کام کررہا تھا' لیکن اس نے کبھی بھی بے ایمانی تک نہیں کی تھی پھر بھلا اب وہ ایسی حرکت کرسکتا تھا...... ہرگز نہیں' دو سال قبل ہی اس نے شادی کی تھی اور اس کی بیوی شکیلہ بھی اس کے ساتھ کام کرنے لگی تھی۔

آج سے سولہ روز بعد بیگم جمشید کے ہاں پارٹی تھی۔ اس سلسلے میں کارڈز بھی تقسیم کردیے گئے تھے' ایسے حالات میں رمضو کی گمشدگی زندگی وموت کا مسئلہ بن گئی تھی۔ رمضو میں یہ انتظامی صلاحیت تھی کہ وہ زیادہ مقدار میں مختلف اشیاء تیار کرسکتا تھا اور کھانا بھی ایسا لذیذ کہ لوگ انگلیاں بلکہ چھری اور کانٹے چاٹتے تھے۔ انگلیوں اور ہاتھوں کی مدد سے تو اس طبقے کے لوگ پانی بھی مجبوراً پیتے تھے' ان کا بس چلتا تو وہ بھی چھری اور کانٹے یا چمچے کے ذریعے پیتے۔

بہرحال قصہ مختصر...... رمضو کو ہر حال میں تلاش کرنا تھا' اس کے لیے مدت بھی مخصوص تھی اور رمضو کے متعلق صحیح طور پر علم بھی نہ تھا کہ وہ کہاں گیا...... اسے زمین کھا گئی یا آسمان چاٹ گیا۔

اس سلسلے میں معاوضے کی رقم پچیس ہزار روپے نقد پیش کردی گئی تھی۔

اب مسئلہ یہ تھا کہ رمضو کو کیسے تلاش کیا جائے تاکہ بیگم جمشید کی عزت پر کوئی آنچ نہ آئے۔

شگفتہ نے جب یہ مسئلہ شرجیل اور شوکت کے سامنے رکھا تو پہلے تو وہ خوب ہنسے پھر سنجیدہ ہوکر اس مسئلے پر غور کرنے لگے...... آخر قرعہ ماموں بھورے کے نام نکلا...... جنہوں نے اس ذمہ داری کو قبول کرلیا تھا کہ وہ وقت مقررہ سے قبل لازمی طور پر رمضو اور اس کی بیوی کا کھوج لگالیں گے۔

☆

صبح جب شکیل کی آنکھ کھلی تو پورے فلیٹ میں وہ اور ادریس ہی تھے' بقیہ لوگ کسی کام سے چلے گئے تھے۔

''یہ لوگ اتنی جلدی کہاں چلے گئے؟'' شکیل نے حیرت سے اس سے دریافت کیا۔ ''کسی سے ملنا تھا انہیں...... اس لیے جلدی چلے گئے...... اب تم بھی جلدی سے تیار ہو جاؤ...... ہمیں بارہ بجے تک ایجنٹ کے پاس پہنچنا ہے اور اس وقت دس بج رہے ہیں۔'' ادریس نے کلائی پر بندھی گھڑی میں وقت دیکھتے ہوئے کہا۔

''بس ابھی پندرہ منٹ میں تیار ہو جاتا ہوں۔'' شکیل نے کہا اور پھر وہ واقعی پندرہ منٹ بعد تیار ہو چکا تھا۔

ساڑھے دس بجے وہ ٹیکسی میں بیٹھ کر ایجنٹ کی طرف جا رہے تھے۔

جس وقت وہ کلفٹن کے ایک سجے سجائے دفتر میں پہنچے' اس وقت ساڑھے گیارہ بج رہے تھے۔ ٹیکسی نے گلستان جوہر سے ایک گھنٹے میں پہنچایا تھا۔

ادریس نے استقبالیہ پر بیٹھی ہوئی خوبصورت سی لڑکی سے پوچھا تھا۔

''مسٹر بٹ تشریف رکھتے ہیں۔؟''

''وہ تو ایک میٹنگ میں گئے ہیں...... آپ تھوڑی دیر انتظار کریں...... ہو سکتا ہے کہ وہ آدھے گھنٹے میں پہنچ جائیں۔'' اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا تھا۔

''تھینک یو......'' ادریس وہاں سے ہٹ گیا تھا۔ پھر وہ تقریباً ایک گھنٹے تک انتظار کرتے رہے لیکن مسٹر بٹ تشریف نہ لائے۔

''سوری سر......!'' لڑکی نے اس کو قریب آتے دیکھ کر کہا تھا۔ ''مسٹر بٹ مصروف ہیں...... وہ شاید آج دفتر نہیں آئیں گے...... کوئی پیغام ہو تو دے دیں۔''

''ہمیں ان سے ہی ملنا تھا...... انہوں نے ہمیں آج بلایا تھا۔ ہم کل آ کر مل لیں گے...... تھینک یو......'' ادریس نے مایوسی سے شکیل کی طرف دیکھا تھا۔

''اب کیا کریں؟'' شکیل نے دفتر سے باہر آ کر اس سے پوچھا تھا۔

''کرنا کیا ہے...... پہلے پیٹ پوجا کریں گے...... اس کے بعد گھر چلیں گے۔'' ادریس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔

وہ دونوں وہاں سے کوچ کے ذریعے صدر تک آئے تھے۔ یہاں انہوں نے ایک ریستوران میں کھانا کھایا

اور پھر اسٹاپ پر آ گئے۔ واپسی کے لیے انہوں نے کوچ کا ہی انتخاب کیا تھا۔

جب وہ اپنے فلیٹ پر پہنچے تو وہ تینوں وہاں موجود تھے۔ اس وقت ساڑھے چار بج رہے تھے۔

ندیم نے ادریس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

''کیا ہوا......کام ہو گیا؟''

''نہیں......ملاقات نہیں ہوئی......اور تمہارا کام......؟''

ادریس کا لہجہ سوالیہ تھا۔

''ہو گیا......!'' ندیم کا جواب مختصر لیکن گہرائی لیے ہوئے تھا جسے صرف ادریس ہی محسوس کر سکتا تھا جبکہ شکیل کے لیے یہ عام گفتگو تھی۔

شام تک وہ سب بیٹھے خوش گپیاں کرتے رہے۔ پھر سہیل اور قادر کھانے پینے کے لیے کچھ لینے چلے گئے۔

رات کا کھانا کھانے کے بعد قادر نے بوتل نکال لی تھی۔

''چلو بھئی ایک دور ہو جائے......'' اس نے ہنس کر کہا تھا۔

''نہیں بھئی......مجھے تو معاف ہی رکھو۔'' شکیل نے اُٹھتے ہوئے کہا تھا۔

''ارے یار......تھوڑی سی پینے سے کچھ نہیں ہوتا......چلو آج ساتھ تو دے ہی دو۔'' سہیل نے اصرار کیا تھا۔

پھر شکیل نے ان چاروں کے ساتھ ہی گلاس اُٹھا لیا تھا لیکن اس نے ابھی دو گھونٹ بھی نہیں لیے تھے کہ اس کا سر چکرانے لگا تھا۔

''یار چکر آ رہے ہیں......لگتا ہے بہت تیز ہے۔'' اس نے جھومتے ہوئے کہا تھا۔

''ارے تمہیں محسوس ہو رہا ہے......ایسا کچھ نہیں ہے......چلو جلدی سے گلاس خالی کرو۔'' ندیم نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔

جبکہ شکیل کو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اس کی دنیا گھوم رہی ہے......اس نے ایک گھونٹ اور لے لیا......اس کے بعد وہ مزید ایک گھونٹ لینا چاہتا تھا لیکن اس کے حواس جواب دے چکے تھے۔ وہ ہوش و حواس سے بے گانہ ہو چکا تھا۔

اس کے نیچے گرنے سے قبل ہی سہیل نے اس کے ہاتھ سے گلاس لے لیا تھا۔

"سالا...... بڑا شریف بنتا تھا......" ندیم نے شکیل کی طرف دیکھتے ہوئے بڑے زہریلے لہجے میں کہا تھا۔
پھر اس کمرے میں ان چاروں کے قہقہے گونج رہے تھے۔



شگفتہ ان دنوں بچوں کے مسائل اور جبری مشقت کے موضوع پر رپورٹنگ کر رہی تھی۔ اس روز وہ گھر سے تمام سامان سے لیس ہو کر نکلی تھی۔ اس کی کار میں ایک عدد جدید ساخت کا کیمرہ، ایک عدد مائیکرو ٹیپ ریکارڈ اور ہینڈی کیم مووی کیمرہ اس کے ساتھ والی سیٹ پر رکھا ہوا تھا۔ وہ اپنی رپورٹنگ کے دوران ہر اعتبار سے جائزہ لیتی تھی اور اپنی معلومات کو ان پر منتقل کر لیا کرتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس کی رپورٹنگ کو مستند سمجھا جاتا تھا کیونکہ اس کے پاس مکمل ثبوت موجود ہوا کرتا تھا۔

صبح کے گیارہ بج رہے تھے جب وہ سہراب گوٹھ پہنچی تھی۔ اس نے پل پار کرنے کے بعد ٹرک اسٹینڈ کے سامنے جھگی ہوٹل کے پاس گاڑی کھڑی کر دی۔ مووی کیمرہ اس نے ہاتھ بڑھا کر اُٹھا لیا تھا۔ اس نے کیمرے کو فوکس کیا اور ٹرک اسٹینڈ کے پیچھے بجری اُٹھا اُٹھا کر ٹرک میں لادنے والے بچوں کی متحرک فلم اپنے کیمرے پر منتقل کرنے لگی۔ ارد گرد کے لوگ اسے تعجب سے دیکھ رہے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ وہاں سے آگے بڑھی۔ بارہ مارکیٹ کے بعد آگے فلیٹ بن رہے تھے' یہاں بھی مزدوروں کے ساتھ بچے کام کر رہے تھے' اسی طرح وہ مختلف جگہوں سے ہوتی ہوئی کافی دور تک چلی آئی تھی۔

دوپہر کے دو بج رہے تھے' اسے بھوک محسوس ہوئی تو اس نے سروس روڈ سے گاڑی واپس موڑ لی۔ بس اسٹاپ سے اس نے گاڑی کا رُخ گلشن اقبال کی طرف کر دیا۔ پلیا پار کرنے کے بعد اس نے ایک برگر پوائنٹ کے سامنے کار روک دی۔ وہاں سے برگر اور کولڈ ڈرنک لینے کے بعد وہ کار میں آ بیٹھی۔ اب اس کا رُخ گلستان جوہر کی طرف تھا۔

اسے معلوم ہوا تھا کہ جوہر چورنگی کے قریب زیر تعمیر عمارتوں کے لیے نہ صرف بچوں سے مزدوری لی جاتی ہے بلکہ مختلف علاقوں میں جیب تراشی کرنے والے بچوں کے گروہ کا مرکز بھی وہیں ہے۔ جب وہ ڈرائیو۔ ان سنیما کے سامنے سے جوہر چورنگی کی طرف مڑی تو اچانک ہی اس کی نظر عقب نما آئینے پر پڑی' ایک سرخ ٹویوٹا آہستہ رفتار سے اس کے پیچھے آ رہی تھی۔ اسے یاد آیا کہ وہ اس کار کو پہلے بھی دیکھ چکی ہے...... کہاں...... اوہ......

وہ مضطرب ہوگئی تھی۔ یہ کار سہراب گوٹھ سے اس کے تعاقب میں تھی۔ اس سے قبل اس نے اسے نظر انداز کر دیا تھا۔ اس نے آزمائشی طور پر اپنی کار کو ایک ذیلی سڑک پر موڑ دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ سرخ ٹویوٹا بھی اس کے پیچھے مڑتی نظر آئی تھی۔ کچھ دور چلنے کے بعد اس نے دائیں طرف کی سڑک پر کار کو موڑ لیا تھا۔ وہ کار اس کے پیچھے تھی۔ اس نے کار کی رفتار کو برقرار رکھا تھا تاکہ اس کے تعاقب میں آنے والے کو شبہ نہ ہوسکے۔

وہ کافی دور نکل آئی تھی۔ اب تعمیر شدہ عمارات کا سلسلہ ختم ہوگیا تھا اور زیر تعمیر عمارات کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا۔ اچانک پچھلی کار کی رفتار میں اضافہ ہوا اور اس سے قبل کہ وہ کچھ سمجھتی' سرخ ٹویوٹا نے اس کے سامنے پہنچ کر بریک لگا دیے تھے۔ شگفتہ اگر فوری طور پر بریک پر جاؤں نہ رکھتی تو کاری ٹکراؤ یقینی تھا۔

اس کی کار رکتے ہی ٹویوٹا سے دو افراد تیزی سے دروازہ کھول کر باہر آئے' شگفتہ نے ایک نظر میں ہی دیکھ لیا تھا کہ اس میں کل تین افراد تھے۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا ہوا آدمی اپنی جگہ پر جما رہا تھا۔ جبکہ باہر آنے والوں کے ہاتھ میں آٹومیٹک ریوالور تھے۔ شگفتہ نے ان کے باہر آتے ہی کار کے اگنیشن میں سے چابی نکال لی تھی۔ اس چابی کے رنگ میں ریموٹ کنٹرول پائپ کی ماچس نما چیز لگی ہوئی تھی۔

ایک نے کار کے دروازے کے ہینڈل پر زور ڈال کر اسے کھولا اور اس سے کہا: ''باہر آجاؤ''۔

شگفتہ خاموشی سے باہر آگئی۔ چابی اس کے دائیں ہاتھ میں تھی۔

وہ دونوں اس ماڈرن لڑکی کو حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ شگفتہ اپنی مہم پر نکلنے کے دوران جینز اور ٹی شرٹ پہنا کرتی تھی' اور اس وقت بھی وہ اس لباس میں تھی۔

''کیا بات ہے......؟'' شگفتہ نے اپنے لہجے کو نارمل رکھا تھا۔ ''کیمرہ کہاں ہے؟'' ان میں سے ایک نے پوچھا۔ اس کے لہجے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ بنگالی ہے۔

''کیا مطلب......؟'' شگفتہ حیران رہ گئی تھی۔ وہ تو یہ سمجھی تھی کہ ان کا تعلق ڈکیت ٹائپ لوگوں سے ہوگا جو نقد رقم طلب کریں گے لیکن یہاں تو معاملہ ہی کچھ اور لگ رہا تھا۔

''مطلب بعد میں بتائیں گے......کیمرہ نکالو......'' دوسرے نے کہا' اس کے لہجے میں دھمکی تھی۔

''سالی کو لے چلو......کیمرہ ہم خود دیکھ لیں گے۔'' پہلے والے نے دوسرے سے کہا۔

شگفتہ کے دماغ میں دھواں بھر گیا تھا' معاملہ کچھ بھی ہو' وہ اپنے لیے یہ لہجہ برداشت نہیں کرسکتی تھی۔ اس نے

غیر محسوس انداز سے چابی کے چھلے سے لگے ہوئے ریموٹ کا رخ اس کی طرف کیا اور ایک بٹن دبا دیا۔ قبل اس کے کہ دوسرا کچھ سمجھتا' شگفتہ کی فلائنگ کک نے اسے الٹ دیا تھا۔ ان لڑاکوں کے وہم وگمان میں بھی یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ یہ نازک سی لڑکی خطرہ ثابت ہوگی۔

شگفتہ نے گرنے والے کو اٹھنے کا موقع نہیں دیا تھا' اس نے ایک زوردار ٹھوکر اس کی کنپٹی پر جمائی تھی اور اس نے ہاتھ پیر ڈھیلے چھوڑ دیے تھے۔ پہلے والا شخص سڑک پر آرا ترچھا پڑا تھا۔ یہ شگفتہ کے ریموٹ سے نکلنے والی ڈارٹ کا کمال تھا۔ مددگار لمیٹڈ کے لیے پس پردہ کام کرنے والی ایک شخصیت نے بطور تحفہ یہ چیز تینوں کو دی تھی تاکہ بوقت ضرورت ان کے کام آسکے' اور آج اس نے کام کر دکھایا تھا۔ ریموٹ سے نکلنے والی باریک سی سوئی نے اس شخص کے جسم میں پیوست ہو کر اسے فوری طور پر ہوش وحواس سے بے گانہ کر دیا تھا۔

شگفتہ اس وقت چونکی جب اسے کار کے اسٹارٹ ہو کر تیزی سے نکلنے کی آواز آئی۔ اس نے دیکھا کہ سرخ ٹویوٹا کار بڑی تیزی سے اس سے دور ہوتی جا رہی تھی۔ ایسے میں شگفتہ نے ان دونوں افراد کے پاس رہنے کو ترجیح دی۔ اس نے کار کے ڈیش بورڈ سے اپنا موبائل فون اٹھایا اور گلستان جوہر پولیس اسٹیشن کو فون کر کے اطلاع دینے لگی۔



پورے پولیس ڈپارٹمنٹ میں کھلبلی مچ گئی تھی۔ بات ہی کچھ ایسی تھی۔

حبیب پبلک اسکول سے تین بچوں کو اغوا کر لیا گیا تھا' بات صرف اتنی نہ تھی۔ ان تینوں بچوں کا تعلق بڑے بڑے گھرانوں سے تھا۔ ان میں ایک بچہ سیٹھ داؤد ابراہیم کا اکلوتا بیٹا تھا' دوسرا معروف صنعت کار ایم اے چھوٹانی کا پوتا تھا جبکہ تیسرا مروف سرجن سعید کیانی کا بیٹا تھا۔ تینوں ایک ہی جماعت میں پڑھتے تھے اور ان کی عمریں آٹھ سے دس کے درمیان تھیں۔

ان کی گمشدگی کے متعلق فوراً ہی پتا چل گیا تھا۔ جب ان تینوں کے ڈرائیور انہیں لینے پہنچے تو معلوم ہوا کہ وہ تو جا چکے ہیں' چھٹی کے بعد بچوں کی بھیڑ میں کسی نے محسوس ہی نہیں کیا کہ وہ علیحدہ علیحدہ جانے کے بجائے ایک خوش پوش نوجوان کے ساتھ ایک کار میں بیٹھ کر جا رہے ہیں۔ ڈرائیوروں نے اسکول سے ہی فون کر کے ان کے گھروں میں ان کی غیر موجودگی کی اطلاع کر دی تھی۔ اگلے تین گھنٹوں کے دوران اس بات کی تصدیق ہوگئی تھی

کہ ان تینوں کو اغوا کیا گیا ہے۔ اغوا کنندگان میں سے کسی شخص نے سیٹھ داؤد ابراہیم کو فون پر اطلاع دی تھی کہ ان کا اکلوتا بیٹا ان کے پاس ہے۔ اگر وہ اس کی بخیریت واپسی چاہتا ہے تو پولیس کو اطلاع دیے بغیر اس کی اگلی ہدایت کا انتظار کرے۔ اسی نوعیت کے فون بقیہ دو کو بھی کر دیے گئے تھے۔ تینوں فون کارڈ فون بوتھ سے کیے گئے تھے۔

وہ تینوں تو اغوا کرنے والوں کے فون کا انتظار کرنے لگے لیکن اسکول کی پرنسپل نے علاقے کے ڈی ایس پی کو ان کی گمشدگی کی اطلاع کر دی تھی۔ یہ اس نے ذاتی بنیاد پر کیا تھا کیونکہ اس سے اسکول کی نیک نامی پر حرف آتا۔ جب مزید تحقیق کی گئی تو صرف سرجن سعید کیانی نے نہ صرف اغوا ہونے کی تصدیق کی بلکہ فون کرنے کا تذکرہ بھی کر دیا تھا۔ ڈی ایس پی نے اپنے بڑوں تک یہ خبر پہنچاوی تھی جس پر ایک ہنگامہ سا مچ گیا تھا۔

اغوا کرنے والوں میں سے ایک شخص نے ان تینوں کو باری باری مختلف جگہوں سے فون کر کے کہا تھا کہ وہ دو روز کے اندر دس دس لاکھ روپے کا بندوبست کرلیں' ادائیگی کا طریقہ اور بچے کی واپسی کے متعلق وہ بعد میں بتائے گا۔ ان تمام باتوں کا علم ان کے گھر کے فون پر آبزرویشن لگانے کے بعد ہوا تھا۔ تینوں کو فون کرنے والے تین مختلف افراد تھے اور انہوں نے ایک ہی وقت میں مختلف جگہوں سے فون کیا تھا۔

اس وقت پولیس ہیڈ کوارٹر میں ڈی آئی جی کی سربراہی میں ہنگامی میٹنگ چل رہی تھی۔

''یہ کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے' ہمیں ان تینوں حضرات کو اعتماد میں لینا ہوگا۔'' ایس پی ملک رب نواز نے اپنی رائے پیش کرتے ہوئے کہا تھا۔

''میرے خیال میں اغوا کرنے والوں کی مزید ہدایت سے پہلے ہی یہ کام کرنا ہوگا تاکہ ہم بروقت عمل کرسکیں...... مجھے وہ کوئی معمولی مجرم نہیں لگتے...... یقیناً ان کے پیچھے کوئی مضبوط ہاتھ ہے...... کیونکہ وہ جس طرح منصوبہ بندی کے تحت کام کر رہے ہیں' اس سے یہی اندازہ ہوتا ہے۔'' ڈی آئی جی جمالی صاحب نے میٹنگ میں موجود پولیس کے اعلیٰ افسران سے مخاطب ہو کر کہا تھا۔

''سر! میرا مشورہ یہ ہے کہ داؤد ابراہیم، چھوٹانی اور سعید کیانی کو بلا کر بات کرنی چاہیے......!'' ڈی ایس پی صفدر نے تجویز پیش کی۔

''واہ...... تاکہ اغوا کرنے والوں کو پتا چل جائے کہ ان کی کارروائی کی اطلاع پولیس کو کر دی گئی ہے اور وہ بچوں کو نقصان پہنچائیں......'' ملک رب نواز نے اسے گھورتے ہوئے کہا تھا۔

''اس سے بہتر ہے کہ ہم ان تینوں سے ان کے گھر یا دفتر میں ملیں' عام آدمیوں کی طرح' تاکہ مجرموں کو شبہ نہ ہو سکے......اور ان کو اعتماد میں لے کر اپنے ساتھ تعاون کرنے کے لیے کہیں......'' ایک اور افسر نے تجویز پیش کی۔

''یہ بہتر ہے......'' ڈی آئی جی جمالی نے کہا: ''ملک صاحب! میں یہ کیس آپ کو سونپتا ہوں......اسے آپ ڈیل کریں اور مجھے اس کی رپورٹ دیتے رہیں۔''

''او کے سر!'' ملک رب نواز نے کہا۔

پھر اس سلسلے میں مزید نکات پر بات چیت ہوتی رہی اور جب یہ میٹنگ ختم ہوئی تو ایک لائحہ عمل ترتیب پا چکا تھا۔



وہ اس وقت ہوش میں تھا' دیکھ سکتا تھا' سن سکتا تھا اور محسوس بھی کر سکتا تھا لیکن حرکت نہیں کر سکتا تھا۔ اسے اپنا جسم سن محسوس ہو رہا تھا۔ وہ حرکت کے لیے ہاتھ اُٹھانا چاہتا تو اسے ایسے لگتا گویا اس میں جان ہی نہیں ہے۔

اس کے ساتھ کئی روز سے یہی ہو رہا تھا۔ وہ جب بھی ہوش میں آتا۔ ان میں سے کوئی ایک اس کمرے میں آتا' اس کے ہاتھ میں ایک سرنج ہوتی تھی۔ وہ سرنج سے سیال اس کے جسم میں منتقل کرتا اور چلا جاتا۔ تھوڑی دیر کے بعد اسے اپنے حواس ختم ہوتے ہوئے محسوس ہوتے اور پھر......شاید ایک طویل عرصہ گزر جاتا' اس کا اپنا خیال یہی تھا۔ کیونکہ اسے جب بھی ہوش آتا' پہلے آنے والا شخص اسے گلاس کے ذریعے کچھ پلاتا تھا' پھر انجکشن لگاتا تھا' وہ اپنے جسم میں ہلکی سی کمزوری محسوس کرتا تھا۔

ایک روز وہ شاید جلدی ہوش میں آ گیا تھا' اس کے کانوں میں ان لوگوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ایک کہہ رہا تھا۔

''بس ایک ہفتے کی بات ہے......اس کے بعد وہ ساری زندگی تڑپ تڑپ کر گزارے گا...... بڑا آیا شرافت زادہ......'' اس کے لہجے میں حقارت تھی۔

''بچوں کا کیا کرنا ہے......یہاں تو خطرہ ہی رہے گا......''

''کوئی خطرہ نہیں ہے......بس تم دیکھتے رہو...... مال آنے دو ہاتھ میں اس کے بعد بتاؤں گا کہ کیا کرنا ہے؟'' دوسری آواز ابھری تھی۔

''اور کل کا کیا پروگرام ہے......کل رات کو جانا بھی ہے......اور اس کے بعد......'' وہ اچانک خاموش ہو گیا تھا۔

''ارے اس کو دیکھ لو پہلے......'' تیسری آواز ابھری تھی۔

وہ سمجھ گیا تھا کہ اس کے متعلق بات ہو رہی ہے۔ وہ آنکھیں بند کر کے لیٹ گیا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد اسے کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی تھی اور پھر وہ واپس چلا گیا تھا۔

''کیا ہوا؟'' پوچھا گیا۔

''بے ہوش ہے سالا......!'' اس نے جواب دیا۔

پھر اس نے ان کی تمام باتیں سن لی تھیں جو بے حد خوفناک تھیں۔ اس نے فیصلہ کیا کہ اب جب وہ ہوش میں آئے گا تو کوئی نہ کوئی فیصلہ ضرور کرے گا۔

اگلی مرتبہ وہ وقت مقررہ سے بہت پہلے ہی ہوش میں آ گیا تھا۔ شاید اس میں اس کی قوتِ ارادی کا بھی دخل تھا۔ اس نے اپنے ہاتھوں، پیروں کو حرکت دینے کی کوشش کی' کافی دیر کی کوشش کے بعد وہ اس قابل ہو گیا کہ اپنے ہاتھوں کو حرکت دے سکے' اس کے نتیجے میں اس پر تھکن بھی طاری ہو گئی تھی۔ وہ سب کچھ یا تو اس جگہ موجود نہیں تھے یا پھر آرام کر رہے تھے۔ تقریباً دو گھنٹے کے بعد ایک شخص نے اندر آ کر اسے دیکھا اور پھر وہی عمل دوہرایا گیا۔

اب وہ پھر ہوش میں تھا۔ کافی دیر تک وہ کسی قسم کی آہٹ محسوس کرتا رہا لیکن ہر طرف خاموشی تھی...... لیکن ......اسے بچوں کے رونے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

اس نے آہستہ آہستہ اپنے ہاتھوں کو حرکت دینے کی کوشش کی...... شاید آج قدرت بھی اس کا ساتھ دے رہی تھی۔ بہت جلد وہ اپنے ہاتھوں کو حرکت دینے لگا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنی ٹانگوں کو دبانا شروع کر دیا تھا' گویا وہ حرارت پہنچا کر انہیں متحرک کر رہا تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ بہت طویل وقت گزر گیا ہے...... آخر وہ اس قابل ہو گیا کہ اُٹھ کر کھڑا ہو سکتا تھا' اس نے قریب پڑی میز کا سہارا لیا اور اُٹھ کر...... اپنے پیروں پر زور ڈال کر کھڑا ہو گیا۔ ایک لمحے کو اسے لگا کہ تمام چیزیں گھوم رہی ہیں...... اسے بڑی زور سے چکر آ گیا تھا۔ اس نے کچھ دیر توقف کیا اور پھر ایک قدم آگے بڑھایا...... پھر ایک اور...... تھوڑی دیر کے بعد وہ ہلکے قدموں سے لڑکھڑاتے ہوئے چل رہا تھا۔

وہ اسی طرح چلتا ہوا دروازے تک پہنچا اور اس سے کان لگا کر سن گن لینے کی کوشش کی...... کوئی آواز نہ تھی' کہ جس سے ظاہر ہوتا کہ یہاں کوئی دوسرا فرد بھی موجود تھا۔

اس نے آہستہ سے ہینڈل گھما کر دروازہ کھولا۔ شاید اسے اس حال کو پہنچانے والے افراد کو اس بات کی توقع

نہ تھی کہ وہ ان کی غیر موجودگی میں ہوش میں آسکتا ہے‘ اسی لیے دروازے کو مقفل نہیں کیا گیا تھا۔

وہ کمرے سے باہر آیا تو اسے دوسرے کمرے سے بچوں کے رونے کی آوازیں آنے لگیں‘ وہ آگے بڑھا اور دروازے کو کھولنے کی کوشش کی...... لیکن جانے والے اس دروازے کو مقفل کر کے گئے تھے...... مگر وہ جانتا تھا کہ چابیاں کہاں مل سکتی ہیں۔ وہ واپس مڑا...... ایک زوردار چکر آیا تھا...... اگر وہ صوفے کا سہارا نہ لیتا تو شاید بری طرح گرتا۔ آنکھوں کے سامنے اچانک ہی اندھیرا سا آگیا تھا...... اس کے جسم میں چیونٹیاں میں رینگنے لگی تھیں۔ وہ آہستہ آہستہ خود کو سنبھالنے لگا...... اس تمام کام تیزی سے کرنے تھے...... جوں جوں وقت گزر رہا تھا......اس کی دھڑکنوں میں اضافہ ہو رہا تھا۔

”یا اللہ...... میری مدد فرما......!“ بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔ اس کی آنکھوں سے اندھیرا آہستہ آہستہ چھٹنے لگا۔ وہ آگے بڑھا‘ شوکیس کے اوپر رکھے گلدان میں ہاتھ ڈالا...... اور پھر...... چابیاں نکال لیں۔ اس وقت تک اس کے حواس بحال ہو چکے تھے۔ اس نے جلدی سے ایک چابی اس دروازے میں لگائی اور ہینڈل گھمایا...... دروازہ کھل چکا تھا۔

وہ تین خوبصورت سے گلاب تھے...... روتے روتے ان کی آنکھیں متورم ہو گئی تھیں۔ دروازہ کھول کر اسے اندر داخل ہوتے دیکھ کر وہ چپ ہو گئے اور حیرت سے اسے دیکھنے لگے۔

”انکل...... مجھے پاپا کے پاس جانا ہے......“ ایک معصوم نے شاید ہمت کر کے روتے ہوئے اس سے کہا تھا۔

”ام...... می...... امی......“ دوسرا بچہ بھی رونے لگا تھا۔

”ادھر آؤ بیٹا...... آؤ...... میں لے چلتا ہوں تمہیں......“ اس کا بھی دل بھر آیا تھا ان کی حالت دیکھ کر...... بچے گوگو کی کیفیت میں مبتلا ہو گئے تھے...... ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اس کے ساتھ جائیں...... یا نہ جائیں۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ ان تینوں بچوں کے ساتھ لڑکھڑاتا ہوا فلیٹ سے باہر آگیا تھا۔ باہر نکلنے کے بعد اسے احساس ہوا کہ اچھی خاصی رات ہو چکی تھی۔ وہ بچوں کو لے کر لفٹ میں داخل ہوا اور پہلی منزل کا بٹن دبا دیا...... وہ گراؤنڈ فلور پر نہیں اترنا چاہتا تھا‘ مبادا کہیں ان لوگوں سے سامنا ہو جائے۔

پہلی منزل پر اترنے کے بعد وہ پچھلے راستے سے بلڈنگ سے باہر نکلا۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ چونکہ یہ کاروباری علاقہ نہ تھا اس لیے رونق بھی نہ تھی۔ وہ ان تینوں کے سہارے آہستہ آہستہ چل رہا تھا...... اس کی طاقت ختم ہو رہی

تھی۔ وہ سڑک پر آیا۔ اس نے ایک دو ٹیکسیوں کو ہاتھ دیا مگر کسی نہ روکا۔

وہ پیدل ہی ایک طرف چل دیا۔ یہ علاقہ اس کا دیکھا بھالا تھا۔ آدھے گھنٹے کے بعد وہ مین روڈ پر تھا۔ وہ روڈ کراس کرنا چاہتا تھا۔ اس نے بچوں کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑا اور سڑک پر قدم بڑھا دیے۔ ابھی وہ سڑک کے درمیان میں ہی پہنچا تھا کہ پھر ایک زوردار چکر آیا۔ وہ اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکا اور تقریباً گرنے کے انداز میں نیچے بیٹھ گیا' اسی وقت کسی گاڑی کی تیز روشنیاں اسے قریب آتی محسوس ہوئیں...... بڑی تیزی سے بریک لگائے گئے تھے اور پھر...... حواس ختم ہونے سے پہلے اس نے بھاری بوٹوں کی آوازیں سنی تھیں۔



پورا اسپتال پولیس کے گھیرے میں تھا' خبر رساں اداروں کے نمائندے اندر جانا چاہتے تھے لیکن اس وقت کسی کو اندر جانے کی اجازت نہ تھی۔

اس وقت لوگوں کی بھیڑ کو چیرتے ہوئے چار افراد گیٹ کے قریب پہنچے' ان میں ایک نوجوان لڑکی، ایک لڑکا اور دو معمر میاں بیوی تھے۔

''میں نے کہا نا...... جناب...... اندر جانے کی کسی کو بھی اجازت نہیں ہے۔'' گیٹ پر موجود انسپکٹر نے ان سے کہا۔

''کیوں نہیں ہے...... بیٹا ہے وہ میرا...... ہم بھی نہیں مل سکتے اس سے......؟'' یہ نیاز احمد خان تھے' ان کے ساتھ عقیل خالدہ اور ان کی اہلیہ تھیں۔

وہاں موجود اخباری نمائندے ان کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ ان چاروں نے ان پر کوئی توجہ نہ دی تھی۔ وہ تو شکیل سے ملنا چاہتے تھے۔ وہ اس وقت ہیرو بن گیا تھا۔

ابھی نیاز احمد خان اور عقیل دفتر جانے کی تیاریوں میں مصروف تھے کہ صبح ہی صبح اخبار والے کی آواز انہیں چونکا دیا۔

''آ گیا...... ضمیمہ آگیا......''

عقیل نے باہر نکل کر اسے آواز دی اور تین روپے کا ضمیمہ خرید لیا۔ آج کل کراچی کے حالات ایسے ہی تھے۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ کون سی آفت آ گئی ہے' لیکن وہ اس کی سرخی دیکھ کر چونک گیا۔

”تینوں اغوا ہونے والے بچے بازیافت“

تینوں بچوں کی تصاویر کے ساتھ جس نوجوان کی تصویر تھی' اسے دیکھ کر وہ چونک گیا۔ یہ ہو بہو شکیل تھا۔

”کہیں یہ شکیل ہی تو نہیں......“ اس نے سوچا۔

”ابو یہ دیکھیں ذرا......!“ اس نے ضمیمہ ان کی طرف بڑھایا اور پھر پورے گھر میں افراتفری مچ گئی۔ اس کے نتیجے میں وہ چاروں اس وقت اسپتال میں موجود تھے۔

”سر ایک منٹ...... میں اپنے صاحب سے بات کرتا ہوں۔“ انسپکٹر نے ان کی بات سن کر شائستہ لہجے میں کہا اور اندر کی طرف چلا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ دوڑتا ہوا باہر آیا تھا۔

”ان کو...... آنے دو......“ اس نے گیٹ پر متعین اہلکاروں سے کہا اور پھر یہ چاروں اس کی رہنمائی میں اس طرف چل دیے جہاں شکیل موجود تھا۔

”ہاں بھئی شوکی...... کچھ پتا چلا......؟“ شرجیل نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”وہ تو میں بعد میں بتاؤں گا...... یہ بتاؤ شگفتہ...... کہ تم نے چیک کیا کہ آخر وہ کیا بات تھی جس کی وجہ سے وہ لوگ تمہارے پیچھے پڑے تھے......؟“ شوکت نے ناک پر چشمہ درست کرتے ہوئے پوچھا۔

”مجھے تو کوئی خاص بات نظر نہیں آئی...... میں کیسٹ لائی ہوں' تم دیکھ کر مجھے بھی بتانا......“ شگفتہ نے دراز میں سے ایک ویڈیو کیسٹ نکال کر اس کی طرف سرکا دی۔

”بہرحال یہ معاملہ تو دیکھا جائے گا...... فی الحال بیگم جمشید کے مسئلے پر سوچو...... یہ ماموں اب تک نہیں آئے...... میں بھی بیگم جمشید کی طرح پاگل ہو جاؤں گا۔“ شرجیل نے شوکت کی طرف دیکھتے ہوئے آنکھ ماری۔

”ہم آسکتے ہیں بیٹا......!“ دروازہ کھول کر ماموں نے گردن نکالتے ہوئے پوچھا۔

”آیئے...... آپ کا ہی انتظار ہو رہا ہے......“ شگفتہ نے بے چینی سے کہا۔

ہمارے ساتھ مہمان بھی ہیں...... ان کو باہر بٹھا دیں پھر آتے ہیں......“ انہوں نے گردن باہر نکالی اور دروازہ بند کر دیا۔ ”لیجیے...... اب مہمانوں کو بھی بھگتیے......“ شوکت نے چشمہ اتار کر صاف کرتے ہوئے کہا۔

تھوڑی دیر کے بعد ماموں اندر آئے اور بیٹھنے سے پہلے ایک کاغذ شگفتہ کی طرف بڑھاتے ہوئے بولے۔

”بیٹا...... یہ ادائیگی کر دینا...... خرچے سے تنگ ہو گیا ہوں۔“

''کیا ہے یہ؟'' شگفتہ نے ان سے کاغذ لے لیا۔
''کرایہ ٹیکسی..... بس کے ٹکٹ..... اور آمد..... اور یہ متفرقات..... کیا ہے یہ سب؟'' شگفتہ نے رقم دیکھی، چھ سو پچاس روپے.....''
''یہ مہمانوں کو ڈھونڈنے اور لانے کا خرچا ہے.....!'' ماموں نے اطمینان سے کہا۔
''کون سے مہمان.....؟'' شگفتہ حیران رہ گئی تھی۔
''وہی بیٹا..... اپنے رمضو میاں، ان کی اہلیہ..... اور دو عدد بھائی.....'' ماموں بولے۔
''کیا.....؟'' تینوں ایک ساتھ چلا اُٹھے۔ ''کہاں ہیں وہ.....؟'' شرجیل نے بے تابی سے پوچھا۔
''باہر بیٹھے ہیں.....'' وہی اطمینان بھرا لہجہ تھا ان کا۔
''ماموں..... ماموں.....'' شگفتہ اپنی سیٹ سے اُٹھی اور گھوم کر ان کے قریب آ کر ان سے لپٹ گئی۔
''کاش..... میں ماموں ہوتا.....!'' شرجیل نے ایک ٹھنڈی آہ بھری۔
''بن جاؤ گے بیٹے..... تم ماموں ہی کہلاؤ گے.....'' شوکی نے شوخ نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا تو شرجیل بھنا گیا۔
''آپ نے کیسے ڈھونڈا انہیں.....'' شگفتہ نے ماموں سے پوچھا۔ پھر ماموں انہیں تفصیل بتانے لگے۔
ان کے مطابق، رمضو سودا سلف لینے بازار پہنچا تو اس کی ملاقات اس کے علاقے کے ایک شخص سے ہوگئی، اس نے بتایا کہ اس کی ماں کی حالت بہت خراب ہے، رمضو کے ساتھ اتفاق سے اس کی بیوی بھی تھی۔ اس نے فوراً بس اسٹاپ کا رُخ کیا اور وہاں سے بس پکڑ کر حیدرآباد چلا گیا۔ اس کی ماں شاید اس کی منتظر تھی۔ اس نے اس کی گود میں جان دے دی۔ اس کے دو چھوٹے بھائی بھی تھے۔ چونکہ اب اس کا وہاں کوئی نہ رہا تھا اس لیے وہ اپنے دونوں بھائیوں کو بھی لے آیا تھا۔ وہ شاید اب بھی نہ آتا لیکن ماموں کے سمجھانے پر وہ ان کے ساتھ آ گیا تھا۔ ''چلو یہ مسئلہ تو حل ہوا.....'' شگفتہ نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ میں ابھی بیگم جمشید کو یہ خوش خبری سناتی ہوں۔''
''مبارک ہو نیاز صاحب..... اب آپ کا بیٹا بالکل ٹھیک ہے۔'' ڈاکٹر سعید کیانی نے انہیں خوشخبری سنائی۔
''بہت بہت شکریہ ڈاکٹر صاحب آپ کا..... اور خاص طور پر ان حضرات کا..... میں ان کا ہمیشہ احسان مند رہوں گا۔'' نیاز احمد خان نے سیٹھ داؤد ابراہیم، چھوٹانی اور ڈی آئی جی جمالی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''ان لوگوں کا کیا ہوا سر......'' عقیل نے جمالی صاحب سے پوچھا تھا۔

''وہ چاروں اب اس دنیا میں نہیں رہے۔'' شکیل کے چہرے پر سفیدی آ گئی تھی یہ سن کر۔

''کیسے......سر......؟'' اس نے تعجب سے پوچھا تھا۔

''تمہارے بیان کے بعد پولیس پارٹی انہیں گرفتار کرنے گئی تھی لیکن انہوں نے مقابلے کو ترجیح دی تھی۔ دو پولیس کی گولیوں کا شکار ہو گئے تھے اور بقیہ دو نے خودکشی کر لی تھی۔'' جمالی صاحب نے مختصر طور پر بتایا۔

''ویسے نیاز بھائی......شکیل کی تربیت کا کریڈٹ آپ کو جاتا ہے......ورنہ وہ چاہتا تو اپنے ساتھیوں کا ساتھ بھی دے سکتا تھا۔'' چھوٹانی صاحب نے ان سے کہا۔

''یہ میرا نہیں چھوٹانی بھائی......رزقِ حلال کا کمال ہے اب اسے بھی چاہیے کہ سنہرے خواب چھوڑ دے اور رزقِ حلال کمائے......اپنے ملک میں بھی بہت کچھ ہے......بس محنت کی ضرورت ہے۔'' نیاز احمد خان سنجیدہ ہو گئے تھے۔

''ابی......تم لوگ کو پھکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے......اپن کا سکیل......اپنے پاس کام کرے گا......محنت کرے گا......اس کو اس کا معاوجہ میں دوں گا......کیوں بچے......ہم ٹھیک بولا......؟'' سیٹھ داؤد ابراہیم نے شکیل کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''ابو......؟'' شکیل اپنے والد سے مخاطب ہوا۔

''میں معافی چاہتا ہوں......میں غلطی پر تھا......مجھے معاف کر دیں......''

''میرا بیٹا......'' نیاز احمد خان کی آنکھیں بھر آئیں اور انہوں نے بڑھ کر اسے گلے سے لگا لیا۔

☆☆☆☆

اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ صرف ان لوگوں کو ہی نہیں بلکہ پوری دنیا کو آگ لگا دے۔

وہ اپنے کمرے میں اکیلی تھی' اس کا چہرہ دیکھ کر ہی بتایا جا سکتا تھا کہ وہ بہت دیر تک روتی رہی ہے۔ اس کے سامنے بیڈ پر ایک لفافہ پڑا تھا جس کے قریب چند تصاویر بکھری ہوئی تھیں۔ اسے یہ لفافہ آج ہی ملا تھا۔

شام کو وہ جب گھر میں داخل ہوئی تو اس کی والدہ نے بڑے ہنستے مسکراتے اس کا استقبال کیا تھا۔ آخر کو وہ پورے گھر کی کماؤ پوت تھی۔ اس نے اپنے والد کے انتقال کے بعد گھر کے اخراجات پورے کرنے کے لیے کئی

جگہ ملازمت کی اور پھر ابھی ایک ماہ قبل ہی تو اسے اس نوکری کی آفر ہوئی تھی۔ اچھی تنخواہ اور بہت سی مراعات......اور انسان کو کیا چاہیے۔

''بیٹی......تمہارے نام ایک خط بھی آیا ہے......شام کو ہی کوریئر والا دے گیا تھا......تمہارے کمرے میں رکھ دیا ہے۔'' اس کی والدہ نے اسے بتایا تو وہ مسکرا دی تھی۔

کل ہی تو اس کی ڈائریکٹر کوثر واحدی نے اس سے کہا تھا۔

''مس لیلیٰ......آپ میں بہت ٹیلنٹ ہے۔ میری کوشش ہوگی کہ اس فوٹو سیشن کے بعد آپ کو آپ کا مقام مل جائے۔ بہر حال کل آپ کو کوئی نہ کوئی خوشخبری ضرور ملے گی۔''

وہ ان کی بے حد ممنون تھی......لیکن اب......اب اگر وہ اس کے سامنے آجاتی تو اس کا منہ نوچ لیتی۔

وہ جاوید اینڈ کمپنی میں اچھی خاصی ملازمت کر رہی تھی۔ اس دن رضیہ نے اس کے سامنے اخبار کا ایک صفحہ پھیلا دیا۔ ''بھئی کام کرنے دو......ابھی باس آجائیں گے اور پھر رپورٹ دینا ہوگی۔'' لیلیٰ ترمذی نے کہا۔

''پہلے یہ دیکھ لو میڈم......اس کے بعد بات کرنا۔'' رضیہ نے ایک اشتہار پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔

اس اشتہار کے مطابق فیوچر کمیونیکیشن کو ماڈلنگ کے لیے لڑکیوں کی ضرورت تھی۔

''پھر میں کیا کروں......؟'' لیلیٰ نے آنکھیں جھپکاتے ہوئے اس سے پوچھا۔

''ارے بھئی ٹرائی کرو......ہو سکتا ہے چانس لگ جائے۔'' رضیہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''یہ بھی ہو سکتا ہے کہ چانس نہ بنے......''

''نہیں......تم میں ٹیلنٹ ہے......اور سب سے بڑھ کر یہ کہ تم کسی حسین اداکارہ سے کم نہیں ہو......بس موقع ملنے کی دیر ہے......'' رضیہ نے کہا۔

یہ حقیقت تھی کہ لیلیٰ ترمذی اکثر و بیشتر اپنی دوستوں سے کہا کرتی تھی کہ اسے ماڈلنگ کا شوق ہے۔ قدرت نے بھی قدرے فیاضی کا ثبوت دیا تھا۔ متناسب جسم اور سب سے بڑھ کر دلکش نقوش......صرف نام لیلیٰ تھا......ورنہ وہ حسینۂ عالم تھی۔

''بہر حال میں شام کو جا کر دیکھتی ہوں۔ تم بھی میرے ساتھ چلنا۔'' لیلیٰ نے رضیہ سے کہا تو وہ آمادہ ہوگئی۔

اشتہار میں ملاقات کا وقت شام کا تھا۔ دفتر سے چھٹی کے بعد وہ دونوں ڈیفینس پہنچیں۔ پتا مشکل نہ تھا......

وہ آسانی سے فیوچر کمیونیکیشن کے دفتر تک پہنچ گئی تھیں۔ وہاں پہلے سے دس بارہ امیدوار موجود تھیں۔ انہوں نے استقبالیہ پر اپنا نام لکھوایا اور انتظار کرنے لگیں۔

تقریباً ایک گھنٹے کے بعد ان کی باری آئی تھی۔ اس وقت بھی ان کے بعد آنے والی امیدواروں کا اچھا خاصا رش لگ گیا تھا۔ بڑا سا ہال نما کمرہ تھا' جس کے درمیان میں ایک بڑی سی میز کے پیچھے دو خواتین بیٹھی تھیں۔

''لیلیٰ ترمذی......؟'' ان میں سے ایک نے پوچھا۔

''جی میں ہوں!'' لیلیٰ نے جواب دیا۔

''تشریف رکھیں......''

''شکریہ......'' وہ بیٹھ گئی۔

''آپ نے اس سے قبل کہیں ماڈلنگ کی ہے؟'' ایک اسمارٹ سی خاتون نے اس سے پوچھا۔

''جی نہیں...... کئی جگہ کوشش کی لیکن کسی نے موقع ہی نہیں دیا۔'' لیلیٰ ترمذی نے جواب دیا۔

''حالانکہ آپ کو لازمی موقع ملنا چاہیے تھا...... کیوں کوثر......؟'' ''ہاں ریحانہ...... فگر اور لک وائز...... شی از پرفیکٹ۔'' کوثر نے جواب دیا۔

''آپ کوئی فوٹو گراف لائی ہیں؟'' ریحانہ نے اس سے دریافت کیا۔

''جی نہیں...... میں تو یونہی آ گئی تھی...... تصویریں تو کھنچوائی پڑیں گی......'' لیلیٰ کو کچھ امید نظر آ رہی تھی۔

''آپ کل آ جائیں...... ہم سیکنڈ فوٹو سیشن کریں گے...... ویسے ضرورت تو نہیں ہے لیکن ہم اپنے کلائنٹس کو بھی مطمئن کرنا چاہتے ہیں۔ ایک بڑی پروڈکٹ کا اشتہار بنانا ہے......'' کوثر واحدی نے اسے بتایا۔

''کل کس وقت......؟'' لیلیٰ کے بجائے رضیہ نے پوچھا تھا۔

''شام کو چھ بجے تک آ جائیں...... میں آپ کو اسٹوڈیو کا کارڈ دیتی ہوں......'' کوثر نے میز کی دراز سے ایک کارڈ نکالا اور اس کی طرف بڑھا دیا۔

''او کے مس لیلیٰ......'' یہ گویا اشارہ تھا کہ ابھی بہت سی دیگر امیدوار بھی موجود ہیں۔ بہرحال دونوں شکریہ ادا کر کے باہر آ گئی تھیں۔

''اچھا بھئی...... میں تو چلی...... میرا گھر تو یہاں سے نزدیک ہے۔'' رضیہ نے بس اسٹاپ کے قریب پہنچ کر کہا۔

''او کے رضیہ...... کل ملاقات ہوگی۔'' لیلیٰ نے جواب دیا۔

رضیہ سڑک پار کر کے سامنے والے رُخ پر چلی گئی جہاں سے کورنگی جانے والی بسیں جاتی تھیں۔

آدھے گھنٹے بعد وہ بھی ایک کوچ میں اپنے گھر لیاقت آباد کی طرف جا رہی تھی۔

''خیریت بیٹی......؟'' دیر سے گھر پہنچنے پر اس کی والدہ نے اس سے پوچھا تھا۔

''ہاں امی ایک کام سے گئی تھی...... کل بھی میں دیر سے آؤں گی فکر نہ کیجیے گا......''

اگلے روز رضیہ نے اس سے معذرت کر لی تھی' اس لیے وہ نرسری کے بس اسٹاپ سے گلشن اقبال تک اکیلی ہی پہنچی تھی۔ خیام اسٹوڈیو...... گلشن چورنگی سے بائیں جانب ایک ذیلی سڑک پر واقع تھا۔ وہ ٹھیک چھ بجے وہاں پہنچی تھی۔

ویٹنگ روم میں آٹھ لڑکیاں پہلے سے موجود تھیں۔ وہ بھی بیٹھ گئی۔ دس منٹ کے بعد چار لڑکیاں اندر سے برآمد ہوئیں' ان کے ساتھ کوثر واحدی اور ریحانہ الیاس بھی باہر آئی تھیں۔ انہوں نے وہاں موجود لڑکیوں پر نظر ڈالی اور پھر وہاں لیلیٰ کو دیکھ کر ریحانہ کی آنکھوں میں چمک سی آ گئی تھی۔

چار لڑکیوں کا انتخاب کیا گیا اور پھر وہ چاروں ریحانہ اور کوثر کے ساتھ اندر اسٹوڈیو میں چلی گئیں۔ ایک گھنٹے کے بعد وہ باہر آئی تھیں۔ اس مرتبہ لیلیٰ بقیہ تین لڑکیوں کے ساتھ اسٹوڈیو میں جانے والیوں میں شامل تھی۔

یہ ہر لحاظ سے ایک مکمل اسٹوڈیو تھا۔ مختلف زاویوں سے کئی طرح کی لائٹیں اور تین کیمرے لگے ہوئے تھے۔ ایک طرف دو بڑی بڑی الماریوں میں مختلف قسم کے لباس ٹنگے ہوئے تھے۔ ان چاروں لڑکیوں کی علیحدہ علیحدہ اور اکھٹے تصویریں کھینچی گئیں اور پھر انہیں رخصت کر دیا گیا۔

لیلیٰ جس وقت گھر پہنچی اس وقت رات کے نو بج رہے تھے۔ کوثر واحدی نے کہا تھا کہ تین روز کے بعد فون کر کے اسے بتا دیا جائے گا۔

چوتھے دن گیارہ بجے ریحانہ الیاس نے فون پر اسے بتایا تھا کہ اس کا انتخاب کر لیا گیا ہے' لہٰذا وہ آج شام کو اسٹوڈیو پہنچ جائے۔

اس کے بعد ایک ہفتے تک وہ اسٹوڈیو جاتی رہی تھی جہاں اسے ایک معروف کمپنی کا ہربل پروڈکٹ کے سلسلے میں ٹی وی کے ایک اشتہار کے سلسلے میں کام کرنا پڑا تھا۔ دو روز کے وقفے کے بعد اسے بیس ہزار روپے کا

چیک اور ایک اور کمرشل کی آخر ملی تھی۔ پھر تو اس کا ہر روز اسٹوڈیو میں گزرنے لگا۔ وہ رات گئے تک کمرشل کے لیے کام کرتی ...... کبھی کبھی تو وہ رات کے ایک بجے گھر پہنچتی تھی۔ پچھلے ایک ماہ میں اس نے چار کمرشل اور تین میگزین کے لیے فوٹو سیشن کروایا تھا جس کی مجموعی آمدنی ستر ہزار روپے کی صورت میں اس کے اکاؤنٹ میں موجود تھی۔

دو روز قبل اسے اچانک شام چار بجے فون موصول ہوا تھا جس کے نتیجے میں وہ فیوچر کمیونیکیشن کے دفتر میں پہنچ گئی تھی۔

''آج کا فوٹو سیشن اشتہاری دنیا میں انقلاب برپا کر دے گا۔'' ریحانہ نے مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھ کر کہا تھا۔

لیلیٰ بھی فخر سے مسکرا دی تھی۔ ایک گھنٹے بعد وہ ریحانہ اور کوثر کے ساتھ اسٹوڈیو میں موجود تھی۔ یہاں پہلے سے دو لڑکیاں اور چار مرد موجود تھے۔ ان میں خیام صاحب نہیں تھے جو اشتہاری فلمیں اور فوٹو گرافی کرتے تھے۔

انتظار کے دوران شربت کا دور چلا اور پھر خیام صاحب آ گئے یہ چالیس کے قریب تھے اور ان کی صحت قابل رشک تھی۔

''آپ لوگ تیار ہیں ......؟'' انہوں نے آتے ہی پوچھا۔

''یس مسٹر خیام ......'' ریحانہ نے مسکرا کر کہا تھا۔

پھر لیلیٰ اور ان دو لڑکیوں نے لباس تبدیل کیے اور دھڑا دھڑ فوٹو کھینچے جاتے رہے۔ آج روشنی کا تناسب کچھ کم تھا۔ دو گھنٹے بعد سب فارغ ہو گئے تھے۔ چلتے ہوئے ریحانہ نے کہا تھا ''مس لیلیٰ ...... اب آپ تیار ہو جائیں ...... آپ کو آپ کی صلاحیتوں کے مطابق معاوضہ ملنے کا وقت آ پہنچا ہے ......!''

''لیکن ریحانہ صاحبہ ...... ابھی تک پہلے والے کمرشل تو چلے ہی نہیں ......!''

''یہ کمپنی کا اپنا مسئلہ ہے ...... ہمارا کام ختم ہو گیا ...... بلکہ ہمارا کام تو اب شروع ہوا ہے ......'' ریحانہ نے ذو معنی انداز سے کہا تھا۔

اس دن اس نے دفتر سے آنے کے بعد کچھ دیر آرام کیا تھا اور پھر جب وہ اپنے کمرے میں پہنچی تو بیڈ پر تکیے کے اوپر لفافہ دیکھ کر اسے اپنی امی اور ریحانہ الیاس کے الفاظ یاد آ گئے ...... اس نے اطمینان سے بستر پر بیٹھ

کر لفافہ کھولا، اس میں پندرہ بیس تصاویر تھیں...... تصاویر تو اسی کی تھیں لیکن...... وہ سب...... وہ تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی...... لیکن یہ حقیقت تھی جو اس کے سامنے تھی۔

وہ تمام تصاویر ایسی تھیں کہ اس کا دماغ بھک سے اڑ گیا تھا۔ تین مرد...... اور وہ...... شرمناک تصاویر...... سب کی سب فوٹو گرافی کی مہارت کا ثبوت تھیں۔

اس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکل پڑے...... وہ روتی رہی...... روتی رہی...... آخر کب تک...... اب تو اس کے آنسو بھی خشک ہو چکے تھے...... صرف ہلکی ہلکی ہچکی آ جاتی تھی۔ اس نے اپنا موبائل فون اُٹھایا اور ریحانہ الیاس کے نمبر ملانے لگی...... دوسری طرف فون شاید بند تھا...... اس نے کوثر واحدی کے نمبر ملائے...... وہ بھی بند تھا...... پھر اس نے کوثر واحدی کے نمبر ملائے...... وہ بھی بند تھا...... پھر اس نے خیام اسٹوڈیو کے نمبر ملائے...... تیسری گھنٹی پر فون اُٹھا لیا گیا...... فون اٹھانے والی آواز ریحانہ الیاس کی تھی۔



''اب تمہاری صلاحیتوں کا پتا سب کو چل جائے گا۔''

مددگار لمیٹڈ میں تینوں کی میٹنگ جاری تھی۔ بھورے ماموں حسب معمول اونگھ رہے تھے۔

''کیا مطلب ہے تمہارا...... کیا میں اداکاری نہیں کر سکتا؟'' شوکت نے اپنی ناک پر چشمہ درست کرتے ہوئے قدرے غصے سے جواب دیا تھا۔ ''بھئی تمہاری اداکاری کا جواب نہیں...... لیکن یہ فیشن شو ہے برادر...... کوئی فلم نہیں کہ دو چار ڈائیلاگ بولے اور بس...... بے شمار لوگ ہوتے ہیں...... سب کے سامنے چلنا پھرنا...... جب کرو گے تو سب پتا لگ جائے گا۔'' شرجیل نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

''قصہ کیا ہے؟...... کب سے تم دونوں ہی ایک دوسرے سے مکالمے بازی کر رہے ہو......؟'' شگفتہ نے تنگ آ کر دخل اندازی کی۔

''اس مرتبہ کا کیس ذرا دلچسپ ہے شگفتہ......!'' شرجیل نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔

''میں بتاتا ہوں......'' شوکت بھی سنجیدہ ہو گیا تھا۔ کراچی میں پچھلے دنوں چار خودکشیاں ایسی ہوئی ہیں، جن کے پس منظر سے ایک حیرت انگیز بات سامنے آئی ہے...... چار خوبصورت لڑکیاں، اپنے اپنے گھرانے کی کفالت کرنے والی...... کچھ کچھ ماڈرن...... اور سب سے بڑھ کر یہ کہ سب اداکاری کے شوق میں مبتلا...... ان

کے گھرانوں سے جو رپورٹ ملی ہے اس کے مطابق انہوں نے اخبار میں ماڈلنگ کا اشتہار پڑھ کر متعلقہ ادارے سے رجوع کیا تھا اور پھر...... اس کے بعد کچھ تاریکی ہے...... لیکن بات سمجھنے کی کوشش کی جائے تو سمجھ میں آجاتی ہے کہ کیا ہوا ہوگا۔ اس کے بعد غیرت کی موت...... یعنی خودکشی...... سب سے حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اس سلسلے میں کوئی بھی ایسا ثبوت نہیں مل سکا جس کی بناء پر کسی کو ملوث سمجھا جا سکے۔"

"کوئی اشتہاری کمپنی...... یا کوئی ایسا ادارہ...... جس سے انہوں نے رابطہ کیا ہو؟" شگفتہ نے اس سے پوچھا۔

"مجھے لگتا ہے کہ شوکت اس معاملے میں کام کر چکا ہے۔!" شرجیل نے شوکت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

"تم بھلا یہ کیسے کہہ سکتے ہو؟" شوکت نے اپنا چشمہ اتار کر ٹشو پیپر سے صاف کرتے ہوئے پوچھا۔

"اس لیے کہ تم مسلسل اداکاری کی باتیں کر رہے ہو...... اور میرے خیال میں یہ بلاوجہ نہیں ہے......!" شرجیل نے مسکراتے ہوئے جواب دیا تھا۔

"اگر یہ بات ہے تو اس مہم کا سربراہ مجھے بنانا پڑے گا...... بولو تم دونوں کو منظور ہے؟" شوکت نے چشمہ اپنی ناک پر جماتے ہوئے کہا۔ "ٹھیک ہے...... بولو کیا کرنا ہوگا......؟" شگفتہ نے اس کی بات مانتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے...... تو پھر تم پہلے تیاری کرو...... تمہیں کل ایک جگہ پہنچنا ہے......!" شوکت نے سنجیدگی سے کہا۔

"کیا مطلب...... کیا تم پلاننگ بھی کر چکے ہو؟" شرجیل نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"تو تم لوگ کیا سمجھ رہے ہو...... کیا میں خالی باتیں ہی بنا رہا ہوں۔" شوکت مسکرا کر بولا تھا۔

"اوکے...... بولو کیا کرنا ہوگا......؟" شگفتہ نے پوچھا۔

"تمہیں کل مکمل تیار ہو کر سنی پروڈکشن کے آفس میں پہنچنا ہے...... وہاں تم ایک ماڈل کی حیثیت سے جاؤ گی...... ویسے بھی تمہیں اداکاری کا شوق تو ہے ہی...... اب ذرا عملی طور پر بھی سہی......" شوکت اس کی طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔

"اب تم پھر پٹڑی سے اتر رہے ہو......" شگفتہ نے اسے گھورا "وہاں تمہارا آڈیشن لیا جائے گا...... اس کے بعد...... اس کے بعد کا پروگرام اس کے بعد طے کریں گے۔" شوکت اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا تھا۔

"اوکے...... چونکہ تم اس مہم کے انچارج ہو لہٰذا میں اور کچھ نہیں پوچھوں گی...... تمہاری ہر بات پر عمل کرنا اب مجھ پر فرض ہے۔" شگفتہ نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

’’ہاں ابھی سے سیکھ لو...... بعد میں کوئی دشواری نہیں ہوگی۔‘‘ شوکت پھر پٹڑی سے اتر گیا تھا۔

’’شو...... کت......‘‘ شگفتہ نے ایک سریلی چیخ کے ساتھ کہا تھا۔’’بدتمیزی نہیں...... میری بات کا مطلب غلط انداسے نہ نکالو......‘‘

’’کاش تم میری بات صحیح طور سے سمجھ لو......‘‘ شوکت نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہا تھا۔

اس دوران شرجیل نے صرف شوکت کو گھورنے پر اکتفا کیا تھا۔ ان کی گفتگو میں دخل اندازی نہیں کی تھی۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ شوکت محض دل بہلا رہا ہے جبکہ شرجیل اس موضوع پر سنجیدگی سے سوچنا چاہتا تھا۔

شوکت نے اپنی باتوں کا ردِعمل جاننے کے لیے اس کی طرف دیکھا تھا مگر کوئی تاثر نہ پا کر وہ حیرت زدہ رہ گیا تھا۔

’’اب ذرا ماموں کو اٹھا دو...... مجھے ان سے ایک ضروری کام ہے۔‘‘ شوکت نے شرجیل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ کیونکہ بھورے ماموں اس کے برابر والی کرسی پر بیٹھے اونگھ رہے تھے۔



’’مے آئی کم ان......‘‘ صائمہ رشید نے دروازہ کھول کر اندر جھانکتے ہوئے پوچھا تھا۔

’’یس...... پلیز......‘‘ اندر موجود ایک فربہ مگر دلکش نقوش کی مالک خاتون نے کہا تو صائمہ ’’تھینک یو‘‘ کہہ کر اندر داخل ہوئی اور اس کے سامنے بیٹھ گئی۔

’’مسز الیاس...... مجھے......‘‘ صائمہ کچھ کہتے کہتے رک گئی تھی۔ ’’ہاں بولیں...... کیا مسئلہ ہے؟‘‘ مسز الیاس نے اس سے پوچھا۔

’’وہ...... دراصل مجھے کچھ ایڈوانس کی ضرورت ہے...... میں نے کل بھی شاید آپ کو بتایا تھا......!‘‘ صائمہ نے ہمت کر کے کہہ ہی دیا۔

’’میں نے آپ کو شاید کل بھی بتایا تھا کہ فی الحال میں کچھ نہیں کر سکتی...... کئی چیک رکے ہوئے ہیں...... جیسے ہی پے منٹ آئے گی...... میں سب کو پے کروں گی...... تنخواہ بھی اور اس کے ساتھ ایڈوانس بھی...... میں شرمندہ ہوں......‘‘ مسز الیاس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی...... شرمندگی کا کوئی تاثر نظر نہیں آ رہا تھا۔

’’کل تک امید رکھوں......؟‘‘ صائمہ نے بے چارگی سے پوچھا۔

”میں کوشش کرتی ہوں کہ کل تک آپ کی ......“ اس کی بات ادھوری رہ گئی تھی کیونکہ میز پر پڑے ہوئے فون کی گھنٹی بجنے لگی تھی۔

”یس......“ اس نے فون اُٹھا کر کہا تھا۔

”ہاں...... بول رہی ہوں...... اوکے...... اوہ...... ہائے مسٹر ریاض...... بھئی بہت مشکل ہے...... نہیں نہیں ...... میں کچھ زیادہ ہی پریشان ہوں...... ایک منٹ......“ اس نے صائمہ کی طرف دیکھا' اس کے چہرے پر اس دوران پریشانی کے آثار نمایاں ہوگئے تھے مگر صائمہ کی طرف دیکھتے ہی اس کے چہرے پر مسکراہٹ آگئی تھی۔

”یس مسٹر ریاض...... اٹ از پاسیبل...... مگر کب...... کیا آج...... اوکے...... میں کوشش کرتی ہوں۔“ اس نے ریسیور رکھ دیا۔

”مسز الیاس! میرے لیے کیا حکم ہے؟“ صائمہ کے لہجے میں بے چارگی بدستور تھی۔

”آپ کا کام ہوگیا......“ مسز الیاس نے مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھا تھا۔

”کیا مطلب؟“ صائمہ حیران رہ گئی تھی۔

”کتنی رقم چاہیے آپ کو......؟“ اس نے سوال کیا۔

”ایڈوانس...... یا تنخواہ......؟“ صائمہ نے امید بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھا تھا۔

”دونوں...... کل کتنی رقم چاہیے؟“ اس کے چہرے پر معنی خیز مسکراہٹ تھی۔

”دس ہزار روپے...... چار ہزار ایڈوانس اور......!“ صائمہ کی بات کاٹ دی گئی۔

”اوکے...... ٹھیک ہے...... ایک کام کرو......“ مسز الیاس قدرے آگے کو جھکی، جیسے کوئی راز کی بات کہنا چاہتی ہو۔ ”جی فرمائیں......“ صائمہ بھی تھوڑا سا آگے کو جھک آئی تھی۔

”مجھے ذرا کام ہے...... اس لیے میں نہیں جاسکتی ورنہ...... خیر...... آپ تو مسٹر ریاض کو جانتی ہیں......؟“ مسز الیاس نے گفتگو کرتے ہوئے اس کی طرف دیکھا تو صائمہ نے سر ہلا دیا گویا وہ مسز ریاض سے واقف تھی۔

”آپ یہاں سے چھٹی کے وقت ان کے دفتر سے ہوتی ہوئی چلی جائیں۔ وہ آپ کو پچیس ہزار روپے دیں گے...... آپ دس ہزار رکھ لیجیے گا...... بقیہ رقم صبح کو دفتر لیتی آیئے گا...... اس طرح آپ کا مسئلہ آج ہی حل ہوجائے گا۔“ مسز الیاس نے کہا تو ایک لمحے کو صائمہ چونکی تھی۔

"لیکن مسز الیاس......ان کا دفتر تو کلفٹن میں ہے......!" صائمہ نے کہا۔

"تو کیا ہوا مس صائمہ......آپ یہاں سے آدھے گھنٹے میں وہاں پہنچ جائیں گی......اگر آپ کے ساتھ کوئی مسئلہ ہے تو پھر میں کل کسی کو بھیج کر رقم منگوالوں گی......آپ بتادیں......" مسز الیاس کے چہرے کی شگفتگی ماند پڑ گئی تھی۔ "نن......نہیں......کوئی ایسا مسئلہ تو نہیں ہے......چلیں ٹھیک ہے......آپ انہیں بتادیں......میں چلی جاؤں گی۔" صائمہ نے کچھ سوچ کر انہیں جواب دیا تھا۔

"اوہ......گڈ......" مسز الیاس کا چہرہ کھل اُٹھا تھا۔ دراصل مجھے ابھی الیاس کے ساتھ ایک میٹنگ میں جانا ہے۔ ورنہ میں خود بھی جاسکتی تھی......ٹھیک ہے آپ جائیں......میں ریاض کو فون کر دوں گی۔" مسز الیاس کے لہجے میں شگفتگی در آئی تھی۔

صائمہ رشید کا تعلق ایک متوسط گھرانے سے تھا۔ والد کا انتقال ہو چکا تھا۔ والدہ اپنے بھائی کے ساتھ رہتی تھیں......یعنی وہ اپنے ماموں کے گھر میں رہتی تھی۔ اکلوتی تھی......بس ضرورت کے مطابق تعلیم حاصل کی تھی اور پھر اس نے دو تین جگہ ملازمت کی تھی' پھر گزشتہ ماہ ہی اس اسسٹنٹ کے طور پر یہ ملازمت مل گئی تھی۔ گھر میں صرف ماموں اور دو ماموں زاد تھے۔ ایک بہن' ایک بھائی......نوید، صائمہ سے دو سال بڑا تھا جبکہ آسیہ اس کی ہم عمر تھی......ممانی تین سال قبل ہی کینسر کے مرض میں مبتلا ہو کر دارفانی کو کوچ کر چکی تھیں' ایک لحاظ سے مکمل گھر تھا......صائمہ نے کئی مرتبہ محسوس کیا تھا کہ نوید اسے پسند کرتا ہے......آسیہ بھی کئی مرتبہ اسی طرح کے خیالات ظاہر کر چکی تھی۔ رہا سوال اس کی والدہ یا ماموں کا......تو انہیں اس پر اعتراض کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ایک لحاظ سے یہ طے تھا کہ صائمہ کو نوید کی دلہن بننا تھا۔ ایک ہی گھر میں رہنے کے باوجود انہوں نے اپنے درمیان اخلاقی فاصلوں کو برقرار رکھا تھا۔ دنیا بھر کے موضوعات پر بات ہوئی تھی۔ لیکن کبھی بھی اپنے دل کا حال بیان کرنے کی نوبت نہیں آئی تھی۔

مسز الیاس کے دفتر سے باہر آنے کے بعد صائمہ رشید اپنی میز پر آ کر بیٹھ گئی تھی۔ نا جانے کیا بات تھی کہ اس کا دل کام میں نہیں لگ رہا تھا۔

زی پبلی کیشنز......ایک ایسا ادارہ تھا جہاں شوقیہ لکھنے والوں کی کتابوں کی کمپوزنگ سے لے کر پرنٹنگ تک کا تمام کام ہوا کرتا تھا۔ گلشن اقبال میں سارہ پلازہ کے تیسرے فلور پر واقع زی پبلی کیشنز کے اس دفتر میں کل چار

افراد کام کرتے تھے۔ ایک ملازم جو صفائی وغیرہ کے ساتھ ساتھ چائے وغیرہ بنا دیا کرتا تھا' ایک آؤٹ ڈور ملازم جو کمپوزنگ، پرنٹنگ وغیرہ سے لے کر پارٹی سے ڈیلنگ بھی کیا کرتا تھا' صائمہ رشید جو دفتر کے بقیہ تمام امور انجام دیتی تھی اور خود مسز الیاس...... ابھی تک پہلے ماہ کی تنخواہ بھی نہیں ملی تھی...... اسے معلوم ہوا تھا کہ یہاں کا یہی طریقہ ہے' جب ہی تو کوئی بھی یہاں زیادہ عرصہ تک ٹک کر کام نہیں کرتا تھا۔

دو کمرے کے اس فلیٹ کو دفتر کا درجہ دے دیا گیا تھا۔ اندرونی کمرے میں مسز الیاس اور بیرونی کمرے میں صائمہ رشید بیٹھا کرتے تھے۔ جبکہ ملازم لڑکا رمضان اکثر باہر ہی رہتا تھا۔ پانچ بجے کے قریب مسز الیاس دفتر سے نکلی اور اس کے قریب آ کر بولی:

''میں جا رہی ہوں...... تم اپنی نگرانی میں دفتر بند کرا کے جانا...... اور ہاں...... ابھی آصف آنے والا ہے...... اس سے میٹر اور چند کتابیں...... لے کر میرے کمرے میں رکھ دینا۔ اب کل ملاقات ہوگی...... ارے...... بھئی میں تمہیں بتانا تو بھول ہی گئی میں نے ریاض کو فون کر دیا تھا...... انہوں نے رقم تیار رکھی ہے' تم یاد سے جا کر لے لینا...... اوکے...... بائی......'' مسز الیاس نے اس کے تاثرات جاننے کی کوشش نہیں کی تھی۔

اب صائمہ کو اس وقت تک کا انتظار کرنا تھا' جب تک آؤٹ ڈور کے لیے کام کرنے والا آصف نہ آ جائے...... اسے بھی شاید آج ہی دیر کرنا تھا۔ وہ ساڑھے چھ بجے آیا تھا۔ اس سے کتابیں اور ایک بڑا سا لفافہ لے کر صائمہ نے اندر کے دفتر میں میز پر رکھا اور پھر رمضان سے دفتر بند کرانے کے بعد وہ بلڈنگ سے باہر آ گئی۔

بس اسٹاپ پر آج کچھ زیادہ ہی رش محسوس ہو رہا تھا۔ بہرحال وہ کسی نہ کسی طرح ایک کوچ کے اگلے حصے میں سوار ہونے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ کلفٹن تین تلوار کے اسٹاپ پر اتر کر اس نے سڑک پار کی اور سامنے ہی مون پلازہ کی لفٹ کے پاس آ کر اس کا انتظار کرنے لگی۔

چھٹی منزل پر ریاض صاحب کا دفتر تھا' جن سے وہ رقم لینے آئی تھی۔ لفٹ آ کر رکی تو اس میں سے بہت سے افراد باہر نکلنے لگے۔ ایک خوبصورت سا نوجوان سب سے آخر میں نکلا تھا۔ جس وقت وہ اس کے قریب سے گزرنے لگا۔ اچانک نہ جانے کیا ہوا کہ وہ لڑکھڑایا اور صائمہ رشید پر آ گرا...... اس اچانک افتاد سے صائمہ بھی حواس باختہ ہو گئی تھی۔ اس کے ہاتھ سے پرس چھوٹ کر گرا اور کھل گیا۔ اس کی چیزیں ادھر اُدھر بکھر گئیں وہ نوجوان اُٹھا اور تیزی سے اس کے قریب آ کر اسے اُٹھانے لگا۔

’’سس......سوری مس......میں......دراصل میرا پیر مڑ گیا تھا......جس کی وجہ سے......‘‘وہ بے حد شرمندہ تھا۔
کوئی اور موقع ہوتا تو صائمہ اس کو بے نقط سناتی اور شاید اسے ایک ہاتھ بھی جڑ دیتی لیکن وہ خاموشی سے اُٹھ گئی۔
’’ٹھیک ہے مسٹر......کوئی بات نہیں......آپ رہنے دیں یہ چیزیں میں خود اُٹھالوں گی......‘‘ صائمہ نے اسے پرس سے نکل کر بکھرنے والی چیزیں سمیٹتے ہوئے دیکھ کر کہا۔
’’اوہ......کوئی بات نہیں مس......ویسے مسز الیاس آپ کے ساتھ نہیں آئیں......‘‘
’’کک......کیا......‘‘ صائمہ رشید حیرت زدہ رہ گئی تھی۔
’’اچھا شکار بھیجا ہے......آپ مجھے کچھ وقت دیں گی مس......‘‘اس نوجوان نے تمام چیزیں پرس میں ڈالنے کے بعد اس کے حوالے کرتے ہوئے کہا تھا۔
صائمہ تو گنگ سی اسے دیکھے جارہی تھی......اس نوجوان کو کیسے پتا چلا کہ......اور اس کا جملہ کہ اچھا شکار بھیجا ہے......آخر کیا مطلب ہے اس بات کا......؟
’’آپ کون ہیں......؟‘‘ صائمہ نے بوکھلائے لہجے میں پوچھا۔
’’صدیقی......مددگار......میں لوگوں کی مدد کرتا ہوں‘ اگر آپ مجھے کچھ وقت دے دیں......تو ایک طرح سے یہ آپ کی مدد ہی ہوگی۔‘‘نوجوان نے کہا۔
’’بولیں......!‘‘
’’یہاں نہیں......باہر کیفے میں......بس صرف پندرہ منٹ‘ آپ مجھے اپنا بھائی سمجھ سکتی ہیں......‘‘نوجوان صدیقی نے پرخلوص لہجے میں کہا تھا۔
پھر شاید اس کے لہجے کا خلوص ہی تھا کہ صائمہ نے اوپر جانے کے بجائے اس کی طرف دیکھا اور کہا تھا۔
’’چلیے......!‘‘
صدیقی نے اس کے ساتھ باہر کی جانب قدم بڑھا دیے۔

☆

’’آپ کو ہماری کمپنی کے ساتھ چھ ماہ کا معاہدہ کرنا ہوگا......مس شگفتہ......!‘‘پرویز اقبال نے اس کی طرف چند کاغذات بڑھاتے ہوئے کہا تھا۔

شگفتہ نے آسانی سے آڈیشن پاس کرلیا تھا۔ اس کے بعد تین روز تک مختلف انداز سے فوٹوسیشن ہوتے رہے۔ اس طرح تقریباً ایک ہفتے کے بعد وہ آج سنی پروڈکشن کے ایم ڈی پرویز اقبال کے دفتر میں موجود تھی۔

''اس میں تمام شرائط موجود ہیں...... آپ پڑھنے کے بعد سائن کردیں تاکہ اگلے مراحل پر کام کیا جاسکے۔'' انہوں نے اس سے کہا تھا۔

شگفتہ نے کاغذات اُٹھائے...... تمام شرائط پڑھنے کے بعد اس نے مختلف جگہوں پر دستخط کرکے وہ کاغذات ایم ڈی کی طرف بڑھادیے۔ ''مس شگفتہ...... آپ کل سے آکر اسکرپٹ کی ریہرسل کرلیں' تاکہ اس پروڈکٹ کے کمرشل کو جلد سے جلد مکمل کرکے دیا جاسکے۔ اس کے بعد اگلے پروجیکٹ پر کام شروع کیا جائے گا۔''

''اوکے مسٹر پرویز...... '' شگفتہ نے اجازت طلب کی اور پھر وہاں باہر آگئی۔

سنی پروڈکشن میں ایک سے بڑھ کر ایک لڑکی آڈیشن کے لیے آئی تھی لیکن ان میں سے صرف پانچ کا انتخاب ہوا تھا جس میں سے ایک شگفتہ تھی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ان سب کو دیکھنے کے بعد شگفتہ کو یہ یقین ہوگیا تھا کہ اس کی دال نہیں گلے گی' لیکن...... شاید شوکت کا خیال ٹھیک تھا کہ اس میں اداکاری کے جراثیم بھی موجود تھے...... آج اس نے معاہدہ بھی سائن کردیا تھا جس کی رو سے وہ چھ ماہ تک ادارے کی پابند تھی' وہ کسی بھی دوسرے ادارے کے لیے نہ تو فوٹوسیشن کراسکتی تھی اور نہ ہی کسی کے لیے کمرشل کرسکتی تھی۔ اسے سنی پروڈکشن کے تحت ہر فوٹوسیشن اور کمرشل کے لیے ایک معقول رقم دی جاتی۔ یہ سب تو اس صورت میں ٹھیک تھا جب اسے صرف یہی کچھ کرنا ہوتا...... لیکن وہ تو کسی مقصد کے تحت یہاں آئی تھی...... اور اب تک اصل مقصد اس کی نگاہوں سے اوجھل تھا...... وہ انہی سوچوں میں بس اسٹاپ پر آئی۔

وہ بس کا انتظار کررہی تھی...... وہ جہاں کھڑی تھی' یہاں سے سامنے والی گلی میں چوتھی بلڈنگ کا وہ گیٹ صاف نظر آرہا تھا جہاں سنی پروڈکشن کا دفتر تھا۔ جیسے ہی اس کی مطلوبہ کوچ آکر رکی' ویسے ہی اتفاقاً اس کی نظر اس طرف دوبارہ چلی گئی جہاں دفتر کے سامنے ایک سفید سوزوکی کار آکر رکی تھی' جس میں سے نکلنے والی خاتون کو دیکھ کر وہ چونکی تھی۔ حالانکہ اس خاتون کے حلیے یا اطوار میں کوئی ایسی بات نہ تھی لیکن نہ جانے کیوں شگفتہ کو ایک جھٹکا سا لگا تھا۔ پھر جس وقت کوچ اس کے سامنے سے گزری تو ایک لمحے کو وہ خاتون اس کی نظر سے اوجھل ہوگئی تھی۔

کوچ گزرنے کے بعد وہ جگہ خالی تھی...... شاید وہ خاتون سنی پروڈکشن کے دفتر میں جاچکی تھی۔

شگفتہ نے جانے کا ارادہ ترک کیا۔ اپنے پیرس میں سے موبائل فون نکالا اور ایک نمبر ملانے کے بعد کسی سے بات کرنے لگی۔



''پر دیکھیے ...... صاحبزادے نے نئے کھیل شروع کر دیے ہیں......'' جمال احمد صدیقی نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے اخبار کا رنگین صفحہ بیگم صدیقی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''واہ کتنا شاندار لگ رہا ہے ہمارا بیٹا......'' نگہت صدیقی نے اخبار میں چھپی ہوئی تصاویر دیکھتے ہوئے کہا۔

اخبار کا پورا صفحہ گزشتہ روز ہونے والے فیشن شو کی تصاویر سے بھرا ہوا تھا۔ ان میں زیادہ تر تصاویر شوکت کی تھیں۔ آخر کو کیوں نہ ہوتیں...... اس نے فنانسر کو اس کے لیے منہ مانگی رقم ادا کی تھی۔ ''بلائیے ذرا...... میں بھی تو پوچھوں کہ کیا کاروبار سے دل بھر گیا ہے یا اس کی رقم یہاں اڑائی جا رہی ہے؟'' جمال صاحب کے لہجے سے غصے کا اظہار ہو رہا تھا۔

''اچھا میں بلاتی ہوں' لیکن کچھ کہیے گا نہیں...... میں اس سے خود بات کرلوں گی......!'' آخر کو ماں تھیں...... بیٹے کی خوشیاں عزیز تھیں...... دوسرے وہ ان تصاویر میں لگ بھی خوبصورت رہا تھا۔ انہیں اپنے بیٹے پر بے ساختہ پیار آ رہا تھا۔

''نوری......'' انہوں نے ملازمہ کو آواز دی۔ ''جاؤ شوکی کو اٹھا دو...... کہہ دو کہ ہم چائے پر انتظار کر رہے ہیں۔'' نگہت صدیقی نے اس سے کہا تو وہ شوکت کو بلانے چلی گئی۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد شوکت ان کے سامنے بیٹھا تھا۔ وہ حسب عادت اپنی ناک پر چشمہ درست کر رہا تھا۔

''جی...... امی آپ نے بلایا ہے؟'' شوکت نے بیٹھنے کے بعد کن انکھیوں سے اپنے والد کو دیکھا تھا۔ اس نے اپنی والدہ کے ہاتھ میں اخبار دیکھ لیا تھا اور اسے فیشن شو کی تصاویر کی جھلک بھی نظر آ گئی تھی جس سے اسے معاملہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی تھی۔

''بیٹے...... تمہارے پاپا' تم سے کچھ پوچھنا' چاہتے ہیں۔'' اس کی والدہ کے لہجے میں پیار تھا۔

''باون ہزار پانچ سو ستر روپے......'' شوکت نے کچھ سنے بغیر ہی کہہ دیا۔

''کیا مطلب......؟ میں سمجھا نہیں......'' جمال صاحب نے حیرت سے شوکت کی طرف دیکھا تھا۔

''اخراجات نکالنے کے بعد کل آمدنی اتنی ہی ہوئی ہے...... ویسے آپ کیا پوچھنا چاہتے ہیں پاپا......؟''
شوکت نے ان کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا تھا۔

''ارے کچھ نہیں بیٹے...... وش یو گڈ لک...... اچھے لگ رہے ہو......'' جمال صاحب جو کچھ دیر قبل حد سے زیادہ سنجیدہ تھے' اب ہنس رہے تھے اور نگہت صدیقی حیرت سے انہیں دیکھ رہی تھیں۔ وہ شاید معاملے کو سمجھ نہ سکی تھیں۔

''تھینک یو پاپا...... ایک بات یاد رکھیے گا پاپا...... میں بزنس مائنڈ باپ کا اَپ گریڈ بیٹا ہوں......'' شوکت نے ٹی پاٹ سے کپ میں چائے انڈیلتے ہوئے کہا تھا۔

''او کے بھئی...... میں تو چلا آفس...... آج چند ضروری معاملات بھی نمٹانے ہیں اور ایک اہم میٹنگ میں بھی جانا ہے......'' جمال صاحب اٹھ کھڑے ہوئے۔

''میں بھی چلوں گا...... مجھے بھی ایک جگہ شوٹنگ پر جانا ہے...... ایک اچھا کنٹریکٹ ملا ہے۔'' شوکت نے بیک وقت اپنی والدہ اور والد کی طرف دیکھا تھا۔

شوکت آج جلدی اُٹھ گیا تھا اور اس نے اپنے والد سے بھی پہلے اخبار کا وہ صفحہ دیکھ لیا تھا۔ اسے امید تھی کہ اس کے والد اسے گوشمالی کے لیے ضرور طلب کریں گے...... وہ بھی آخر ان کا ہی بیٹا تھا...... ان کی عادات و فطرت سے اچھی طرح واقف' لہٰذا اس نے دو جملوں میں ہی معاملہ ختم کر دیا تھا۔

یہ بھی حقیقت تھی کہ اسے آج بہت سے کام کرنے تھے۔ ان میں سے ایک معاملہ صائمہ رشید کا بھی تھا۔ وہ کافی دنوں سے اس سلسلے میں تحقیقات میں مصروف تھا۔ اسے شاید اس معاملے کا پتا بھی نہ چلتا...... اگر اس روز رات گئے وہ لڑکی اس کی کار کے سامنے اچانک نہ آجاتی۔

اس رات وہ مسٹر گشت کر رہا تھا۔ طبیعت عجیب سی تھی' اس لیے وہ کار لے کر نکل پڑا' اس کا ارادہ تھا کہ وہ ساحل کی طرف گھوم پھر کر واپس آجائے گا۔ جس وقت وہ تین تلوار کے سگنل سے آگے کی طرف بڑھا' اس کی کار کی رفتار آہستہ رکھی تھی اور شاید یہی وجہ تھی کہ جس وقت وہ لڑکی اس کی کار کے آگے اچانک آئی تو اس نے نہایت ہوشیاری سے بریک لگا دیے تھے۔ اس کے باوجود کار کا اگلا حصہ اس لڑکی سے ٹکرا گیا تھا۔ اس وقت رات کے بارہ بجے تھے' سڑکوں پر رش نہ ہونے کے برابر تھا۔ شوکت تیزی سے دروازہ کھول کر باہر آیا۔ وہ لڑکی غالباً بے ہوش ہو چکی تھی۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا' اکا دکا گاڑیاں اس کے قریب سے گزر رہی تھیں لیکن کسی نے بھی معاملا

جاننے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس سے لوگوں کی بے حسی کا اظہار ہوتا تھا۔ شوکت نے تیزی سے لڑکی کو اٹھایا اور اپنی کار کا پچھلا دروازہ کھول کر اسے لٹا دیا۔ خاصی خوبصورت لڑکی تھی' نا جانے کیا معاملہ تھا۔ بہر حال وہ فوراً ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا اور سید ھا مڈ ایسٹ اسپتال کے کمپاؤنڈ میں لے گیا۔ فوراً اسٹریچر لایا گیا اور مریضہ کو اسپیشل وارڈ میں پہنچا دیا گیا۔ شاید اتنی توجہ نہ ملتی اگر شوکت نے اپنے دوست ڈاکٹر جمیل بابر کو نہ بلوالیا ہوتا۔ ڈاکٹر جمیل بابر نائٹ شفٹ میں اسی اسپتال میں انچارج تھا۔

رات دو بجے شوکت اس لڑکی کو جمیل کی نگرانی میں دے کر گھر واپس آ گیا تھا اور اگلے دن وہ صبح ہی صبح پھر اسپتال میں موجود تھا' جہاں اسے بتایا گیا کہ ڈاکٹر جمیل اسپیشل وارڈ نمبر پندرہ میں اس کا انتظار کر رہے ہیں۔ رات کو اس کی گاڑی سے ٹکرانے والی لڑکی کو ہوش آ گیا تھا اور وہ شوکت سے ملنا چاہتی تھی۔

پھر جب شوکت اس سے ملا تو اسے بڑی مشکل سے اس بات پر راضی کر لیا تھا وہ اسے حقیقت بتائے' اس کے لیے اس نے بڑے نفسیاتی حربے آزمائے تھے۔ جب اسے اس کی اصل حقیقت پتا چلی تو چند لمحات کے لیے وہ گم سم سا ہو گیا تھا...... کیا اس معاشرے میں ...... اس جدید شہر میں ...... قانون کی آنکھوں تلے...... ایسا بھی ہو سکتا ہے؟...... اس کا مکمل ثبوت وہ لڑکی تھی' اس نے اپنا نام لیلیٰ ترمذی بتایا تھا۔



''لیکن آپ نے تو آج کمرشل کی شوٹنگ کے متعلق کہا تھا...... پھر یہ اچانک تبدیلی کیسے......؟'' شگفتہ اس وقت سنی پروڈکشن کے ایم ڈی پرویز اقبال کے سامنے بیٹھی تھی۔

''اصل میں مس شگفتہ...... وہ کمرشل تو پارٹی کو ایک ہفتے بعد دینا ہے لیکن یہ فوٹو سیشن ہر صورت میں کل دینا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اس میں آپ کا ہی بھلا ہے...... کیونکہ اس سیشن کے بعد آپ کی مانگ میں اضافہ ہو جائے گا۔''

''اور معاوضے میں بھی......'' یہ جملہ پرویز کے برابر ایک خوبصور نقوش کی مالک' فربہ جسم والی ایک خاتون نے کہا تھا۔

''یہ فیوچر کمیونی کیشن کی ریحانہ ہیں...... یہی فوٹو سیشن کروا رہی ہیں ایک پارٹی کے لیے......'' پرویز نے اس کا تعارف کروایا تھا۔

اس کا نام سن کر شگفتہ ایک لمحے کو چونکی تھی لیکن اس نے اپنے چہرے سے کسی قسم کے تاثرات کا اظہار نہیں کیا تھا۔

''کب ہے فوٹو سیشن؟'' شگفتہ نے خود کو ذہنی طور پر تیار کرتے ہوئے سوال کیا۔

''شام سات بجے...... خیام اسٹوڈیو میں......!'' ریحانہ نے اس کی بات کا جواب دیا۔

''ابھی تو تین گھنٹے باقی ہیں......'' شگفتہ نے اپنی کلائی پر موجود گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

''آپ کو کوئی کام تو نہیں ہے؟'' پرویز نے اس سے سوال کیا۔ ''کوئی خاص تو نہیں...... لیکن ایک دوست سے ڈنر کا وعدہ کر چکی ہوں...... اگر دیر ہوگئی تو......'' شگفتہ نے جان بوجھ کر جملہ ادھورا چھوڑا تھا۔

''ارے نہیں مس شگفتہ...... دس بجے کے بعد آپ فارغ ہیں' چاہیں تو دس بجے آپ اسے وہیں بلوالیں...... اس کے بعد ان کے ساتھ ہی چلی جایئے گا۔'' ریحانہ نے اس کی طرف مسکرا کر دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

''ٹھیک ہے...... تو میں اس کو فون کر دیتی ہوں......'' شگفتہ نے کہا۔ ''آپ مجھے خیام اسٹوڈیو کا ایڈریس دے دیں......''

ریحانہ نے ایک کارڈ نکال کر اسے دیا اور شگفتہ نے سامنے میز پر پڑا ہوا فون اپنی طرف کھسکا لیا۔ اس نے ایک نمبر ملایا اور اسے بتانے لگی کہ وہ فی الحال ایک فوٹو سیشن میں پھنس گئی ہے لہٰذا وہ دس بجے خیام اسٹوڈیو میں پہنچ جائے۔

''میں چلتی ہوں پرویز صاحب...... مجھے بقیہ انتظامات بھی کرنے ہیں' اور آپ مس شگفتہ سات سے پہلے لازمی پہنچ جائیں۔'' ریحانہ جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

''میرے خیال میں' میں آپ کے ساتھ ہی چلتی ہوں۔'' شگفتہ نے ریحانہ سے کہا تو وہ ایک لمحے کے لیے ساکت رہ گئی تھی۔

''ارے آپ کہاں میرے ساتھ ساتھ خوار ہوں گی...... مجھے ابھی کئی جگہ جانا ہوگا...... میرے خیال میں آپ ٹیکسی سے آجائیں...... میں پے کردوں گی......'' ریحانہ نے فوری طور پر جواب دیا تھا گویا وہ کسی وجہ سے اسے ساتھ لے جانا نہیں چاہتی تھی۔

''نو پرابلم مس ریحانہ...... میں آپ کو پندرہ منٹ پہلے وہیں ملوں گی...... اوکے...... میں چلتی ہوں۔'' شگفتہ بھی اس کے ساتھ ہی کھڑی ہوگئی تھی۔

وہ اس کے ساتھ ہی باہر آئی تھی۔ باہر سفید سوزوکی کار کھڑی تھی جسے ریحانہ خود ہی ڈرائیو کر کے چلی گئی تھی۔

اس کے جانے کے بعد شگفتہ بس اسٹاپ پر آئی۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا اور ایک طرف چل دی۔ تقریباً ایک فرلانگ دور اس کی سرخ آلٹو کھڑی ہوئی تھی۔ جس وقت وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر کار اسٹارٹ کر رہی تھی' اس کے لبوں پر ایک معنی خیز مسکراہٹ تھی۔

دس منٹ کے بعد کار ڈرائیو کرتے ہوئے اس نے پرس سے اپنا موبائل نکالا اور شرجیل کا نمبر ملانے لگی۔ پرویز اقبال کے دفتر سے اس نے شوکت کو فون کیا تھا۔



اس فوٹو سیشن میں شگفتہ کے علاوہ تین لڑکیاں بھی حصہ لے رہی تھیں۔ شگفتہ ہر ہر مرحلے پر ہوشیار تھی۔ ریحانہ اور چار مرد ایک طرف بیٹھے مختلف انداز سے پوز دیتی ہوئی ان لڑکیوں کو دیکھ رہے تھے۔ مردوں کی نگاہوں میں ہوس صاف محسوس کی جاسکتی تھی۔

دو گھنٹے کے بعد پانچ منٹ کا وقفہ دیا گیا۔ اس وقفے میں خیام صاحب نے شربت منگوالیا تھا۔ شگفتہ نے شربت پینے کی محض اداکاری کی تھی۔

پھر لباس تبدیل ہوئے اور روشنیاں مدھم کردی گئیں اس مرحلے میں وہ چاروں مرد جو غالباً ماڈل ہی تھے' ان کے ساتھ شامل ہو کر مختلف پوز دینے لگے۔ شگفتہ نے محسوس کیا کہ تینوں لڑکیاں سرور کی کیفیت میں مبتلا ہو کر ان کے ساتھ آزادانہ فوٹو سیشن کروا رہی تھیں۔ بہرحال شگفتہ کو بھی ان کی نقل کرنا تھی۔ خیام صاحب کے موبائل کی گھنٹی بجی اور وہ ''ایک منٹ'' کہہ کر باہر چلے گئے...... تھوڑی دیر کے بعد وہ واپس آئے اور کیمرے کے پیچھے کھڑے ہوگئے۔ کیمرے کے پیچھے زیادہ اندھیرا تھا' اس لیے کسی نے اس خاص بات کو نوٹ نہیں کیا تھا۔

''بس اب کھیل ختم ہوگیا......!'' یہ الفاظ نہ تھے' گویا دھماکا تھا' جس سے وہ سب تو چونکے ہی تھے لیکن ریحانہ بوکھلا کر کھڑی ہوگئی تھی۔

اچانک پورا کمرہ تیز روشنی میں نہا گیا۔ شگفتہ کا ہاتھ بڑی تیزی سے حرکت میں آیا تھا۔ اس نے جھپٹا مار کر ریحانہ کا پرس اس سے چھین لیا تھا۔ ریحانہ نے آواز کی طرف دیکھا تھا جو کیمرے کے پیچھے سے آئی تھی۔ وہاں ایک خوبصورت سا نوجوان کھڑا تھا' جس کے چہرے پر گولڈن فریم کا چشمہ چمک رہا تھا۔ وہ بار بار آنکھیں جھپکا رہا تھا۔

''کون ہو تم......'' ریحانہ نے بوکھلا کر پوچھا تھا۔ اس نے شگفتہ کی حرکت کو بھی حیرت سے دیکھا تھا۔

’’خادم کو شوکت صدیقی کہتے ہیں۔‘‘ اس نوجوان نے کہا جو درحقیقت شوکی ہی تھا۔ اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا جس کا رُخ ان سب کی طرف تھا۔ پھر اس نے بائیں ہاتھ سے موبائل نکالا اور ری ڈائل کا بٹن دبا کر سلسلہ ملنے کا انتظار کرنے لگا۔ ایک منٹ کے اندر سلسلہ ملتے ہی اس نے کہا۔

’’سب ٹھیک ہے...... کم آن......!‘‘

جنہیں فون کیا گیا تھا‘ وہ شاید باہر ہی موجود تھے‘ کیونکہ تھوڑی دیر بعد ہی بھاری جوتوں کی آوازیں تیزی سے اندر کی طرف آ رہی تھیں۔



مددگار لمیٹڈ کے دفتر میں آج میلے کا سماں تھا۔ میز کے پیچھے کرسیوں پر شگفتہ، شرجیل، شوکت بیٹھے تھے‘ ان کے ساتھ ہی بھورے ماموں بھی حسب معمول کرسی پر بیٹھے اونگھ رہے تھے۔ ان کے سامنے صوفے پر صائمہ رشید، نوید، ان دونوں کے والد، والدہ کے علاوہ لیلیٰ ترمذی اپنی والدہ کے ساتھ بیٹھی تھی‘ ڈاکٹر جمیل بابر کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔ ایک طرف تین کرسیوں پر دیگر افراد بھی بیٹھے تھے‘ جن کا تعارف شگفتہ وغیرہ میں سے کسی نے نہیں کرایا تھا۔

’’برائی کا انجام ہمیشہ سے برا رہا ہے......‘‘ شوکت کہہ رہا تھا: ’’اخبارات میں لڑکیوں کی خودکشی کے واقعے کے بعد میرا ذہن یہی کہہ رہا تھا کہ اس کے پس پردہ کوئی کھیل ہے...... پھر مجھے لیلیٰ مل گئی...... اس نے مجھے بتایا کہ اس کے ساتھ کیا کیا ہوا تو ہم نے ان لوگوں کے خلاف پلاننگ کی...... اس دوران ریحانہ الیاس کا پیچھا کرتے ہوئے مجھے معلوم ہوا کہ اس نے ایک دفتر بھی قائم کیا ہوا ہے‘ تاکہ اگر اس پر کوئی حرف آئے تو وہ اپنا بچاؤ کر سکے...... لیکن اس نے وہاں بھی اپنا کھیل جاری رکھا تھا۔ صائمہ کو میں نے وہیں دیکھا تھا۔ ریاض، کوثر واحد، پرویز اقبال اور ریحانہ سب نے مل کر مختلف ادارے بنائے تھے جو ماڈلنگ کی شوقین لڑکیوں کو اداکارہ بنانے کا جھانسا دے کر ان کی مجبوریوں سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے۔ خیام اسٹوڈیو کا مالک خیام بھی ان ہی کا ساتھی تھا۔ اس نے جدید طریقوں سے پورا پورا فائدہ اُٹھایا تھا۔ وہ کیمروں کے لینس تبدیل کر کے جدید ساخت کے لینس لگا دیا کرتا تھا جو دھیمی روشنی میں اپنا کمال دکھاتے تھے۔ بہرحال قصہ مختصر...... یہ سب گرفتار ہو چکے ہیں‘ یہ مددگار لمیٹڈ کا کارنامہ ہے...... آپ سب مددگار ہیں‘ جو قانون کی مدد کرتے ہیں‘ برائی کے خلاف ہیں‘ امن...... سکھ...... چین کے خواہاں ہیں......‘‘

شوکت نے اپنی بات ختم کر کے شگفتہ کی طرف دیکھا تھا۔

''تھینک یو شوکت...... یہ کوئی میٹنگ نہیں ہے بلکہ ایک تقریب ہے...... ہم نے سوچا کہ ذرا سی انفرادیت ہونی چاہیے...... لہٰذا یہ گھر کے بجائے اس دفتر میں ہو رہی ہے۔'' شگفتہ نے مسکراتے ہوئے ان سب کی طرف دیکھا تھا۔

''تقریب...... کیسی تقریب......؟'' بھورے ماموں نے چونک کر آنکھیں کھول دی تھیں۔ پھر ان کا ہاتھ اپنے بٹوے کی طرف بڑھا تھا' جس میں وہ پان کی گلوریاں بنا کر رکھتے تھے۔

''ڈاکٹر جمیل باہر...... لیلیٰ کا ساتھ چاہتے ہیں......'' شگفتہ نے مسکراتے لیلیٰ اور جمیل کی طرف دیکھا تھا۔

لیلیٰ کے ہونٹ کپکپا رہے تھے' اس کی آنکھوں میں نمی صاف محسوس کی جا سکتی تھی۔ شاید کسی اندرونی خوشی کی وجہ سے یا پھر...... شکر گزاری کے احساس کی وجہ سے......!!

''ہم نے ان دونوں کو ایک دوسرے کو سمجھنے کا موقع دیا ہے' غلطیاں انسان سے ہی ہوتی ہے اور کسی غلطی کی سزا یہ نہیں ہوتی کہ اسے زندگی سے محروم کر دیا جائے...... ڈاکٹر جمیل مددگار لمیٹڈ کے رکن ہیں...... اس طرح لیلیٰ بھی آج سے ہمارے ادارے کی باقاعدہ رکن بن گئی ہیں...... انہوں نے باقاعدہ ایک درخواست دی تھی...... جس پر غور کر کے منظور کر لیا گیا ہے' اور...... یہ تقریب اسی سلسلے کی ہے...... مبارک ہو مس لیلیٰ۔'' شرجیل جو کافی دیر سے خاموش بیٹھا تھا' اس نے اس تقریب کے سلسلے کی وجہ بیان کی تھی۔

''تمہیں بھی مبارک ہو جمیل......!'' شوکت نے قدرے اونچی آواز میں ڈاکٹر جمیل باہر کو مخاطب کیا تھا۔

''کیا......؟'' اس نے سوالیہ انداز سے شوکت کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

''لیلیٰ......!'' شوکت نے اسی طرح بلند آواز سے کہا تو ڈاکٹر جمیل جھینپ گیا جبکہ لیلیٰ کے چہرے پر شرمگیں مسکراہٹ تھی۔



''خون ہی سفید ہوگیا ہے کم بخت کا...... مر چکا ہے وہ ہمارے لیے......لحاظ، مروت اور اپنے پرائے کی تمیز بھی فراموش کر چکا ہے وہ......'' اصغر علی نے غصے سے رقیہ سے کہا تھا۔

یہ حقیقت بھی ہے کہ جب خون میں سفید ذرّات کی زیادتی ہو جائے تو انسان ایک لحاظ سے مُردہ ہی تصور کیا جاتا ہے' اصغر علی نے جو کچھ کہا تھا وہ ایک لحاظ سے ٹھیک ہی تھا۔

وہ دو ہی تو بھائی تھے۔

دس سال قبل تک اچھا خاصا خوش حال اور ہنستا مسکراتا گھرانا تھا۔ عبدالقیوم نے سوچا بھی نہ تھا کہ ان کا بڑا بیٹا' ان کا بازو، ان کے بڑھاپے کا سہارا...... یوں ان کا گھر...... بلکہ سب کچھ' صرف ایک عورت کے لیے چھوڑ کر چلا جائے گا......اس نے ہر چیز فراموش کر دی تھی' باپ کی شفقت...... بھائی کی محبت' ان کا خلوص......سب کچھ بھول گیا تھا وہ......اس میں قصور اگر اکبر علی کا تھا تو بے قصور رابعہ بھی نہ تھی...... پھر وہ تو ویسے بھی ماڈرن گھرانے سے تعلق رکھتی تھی......اس کے گھر میں ہر طرح کی آزادی تھی......اور اسی آزادی کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے اس نے اکبر علی کو اپنی زلفوں میں جکڑ لیا تھا......وہ بھی...... جو بڑے بڑے دعوے کرتا تھا' اس کے جال میں کچھ اس طرح پھنسا کہ اس کی بولی بولنے لگا تھا۔

عبدالقیوم نے بہت دکھ جھیلے تھے......وہ درحقیقت آگ اور خون کا سمندر پار کر کے اس نومولود ملک میں پہنچا تھا' اس نے اپنا سب کچھ چھوڑ دیا تھا......تمام رشتوں کی قربانی دی تھی اس نے......وہ رشتوں اور ملک کی قدر جانتا تھا۔

ہجرت کرنے والے قافلے پر جب ہندوؤں نے دھاوا بولا تو اس کی عمر بمشکل بارہ سال تھی' وہ تو اس سمیت تمام قافلے والوں کو قتل کر کے چلے گئے تھے لیکن قدرت کو اس کی زندگی مقصود تھی' ایک سکھ کو اس پر رحم آگیا تھا۔ وہ زخمی عبدالقیوم کو اپنے سینے سے لگائے اپنے گھر لے گیا تھا' اس نے ایک سکھ ڈاکٹر سے اپنا بیٹا کہہ کر علاج کرایا تھا اس کا...... پھر جب آگ سرد پڑنے لگی تو اس نے اسے سرحد پار کرا دی تھی کہ اس کی حقیقی منزل تو وہی تھی...... پاک سرزمین......جہاں کیمپ میں دوسروں کی طرح عبدالقیوم بھی تنہائی محسوس کر رہا تھا۔ لوگ تو اپنے رشتہ داروں کو ڈھونڈتے پھر رہے تھے لیکن وہ کس کو تلاش کرتا......اس کے اپنے تو شہید ہو چکے تھے......دوسرے تو اپنوں کی

آس میں جی رہے تھے لیکن عبدالقیوم کسی کو اپنا بنانے کی آس میں زندگی گزار رہا تھا۔

اگر اس روز منشی کریم خان اسے اپنے ساتھ نہ لے آتے تو...... شاید چند دن بعد وہ اس دنیا کو ہی خدا حافظ کہہ دیتا۔ اس نے حتمی فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اس تنہائی کی زندگی سے نجات حاصل کر لے گا...... مگر قسمت...... منشی کریم خان لاولد تھے اور تقسیم میں اپنی اہلیہ کی شہادت کے بعد ایک کوارٹر میں تنہا زندگی گزار رہے تھے...... اس روز وہ اتفاق سے کیمپ چلے آئے تھے...... نہ جانے جی میں کیا آئی تھی...... یا پھر شاید قدرت نے ہی ان کے دل میں یہ بات ڈال دی تھی۔ انہوں نے ایک تنہا گوشے میں عبدالقیوم کو سر جھکائے بیٹھے دیکھ لیا تھا۔ وہ اس کے قریب آئے۔

''بیٹا...... یہاں اکیلے کیوں بیٹھے ہو......؟'' انہوں نے بڑی شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا تھا۔

وہ تو تھا ہی شفقت اور محبت کا بھوکا اور پیاسا...... ایک عرصے کے بعد ان میٹھے بولوں نے اس کے اندر طوفان برپا کر دیا تھا...... اس کی ہچکیاں بندھ گئیں...... وہ رو رہا تھا...... وہ روتا رہا...... منشی کریم خان جہاندیدہ تھے...... تمام معاملہ سمجھ گئے تھے' اس لیے وہ اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے رہے' اور اس کے غبار کے نکلنے کا انتظار کرنے لگے...... بہت دیر بعد وہ چپ تو ہو گیا تھا لیکن ہچکیاں اب بھی آ رہی تھیں۔

پھر عبدالقیوم ان کے ساتھ ان کے دو کمروں کے اس کوارٹر میں آ گیا تھا۔ انہوں نے اس کی تعلیم کا بندوبست کیا...... عبدالقیوم کی ذہانت اس کے کام آئی اور وہ ہر سال امتیازی نمبروں سے پاس ہوتا چلا گیا۔ بی اے کے امتحانات کے بعد منشی کریم خان نے اس کی شادی کر دی تھی...... جس دن اس کا نتیجہ نکلا اسی روز منشی جی نے آنکھیں بند کر لیں...... انہوں نے اپنا فرض پورا کر دیا تھا۔

عبدالقیوم نے سرکاری ادارے میں نوکری حاصل کر لی اور پھر زندگی ایک نئی ڈگر پر چلنے لگی۔ منشی کریم خان بھی سرکاری ملازم تھے' ان کے بقایاجات کی اچھی خاصی رقم انہیں ملی تھی۔ عبدالقیوم نے اپنی بیوی کلثوم کے مشورے پر شہر سے باہر نہایت سستے داموں ایک بڑا قطعہ زمین خرید لیا تھا...... شہر کی آبادی تیزی سے بڑھ رہی تھی اور اسی اعتبار سے زمین کی قیمت بھی بڑھتی۔

ازدواجی زندگی کے پانچ برس بعد اکبر علی نے اس گھر میں آنکھ کھولی، اس کے دو سال بعد اصغر علی پیدا ہوا۔ ابھی اکبر علی دس سال کا بھی نہیں ہوا تھا کہ کلثوم ان سب کو تنہا چھوڑ کر اپنے مالک حقیقی کے پاس چلی گئی۔ عبدالقیوم

نے اپنی توجہ اور محبت اپنے دونوں بیٹوں پر صرف کردی تھی۔ گزرتے دنوں کے ساتھ اکبر اور اصغر تعلیمی مدارج بھی طے کرتے رہے۔ پھر اکبر اور اصغر اپنے پیروں پر کھڑے ہوگئے۔ اکبر علی کو ایک غیر ملکی کمپنی میں منیجر کے عہدے پر ملازمت مل گئی تھی جبکہ اصغر ایک دفتر میں نائب کے عہدے پر کام کر رہا تھا۔

جب اولاد بڑی ہوجائے' تعلیم سے فارغ ہوکر اپنے اپنے پیروں پر کھڑی ہوجائے تو ماں باپ کی خواہش ہوتی ہے کہ ان کے سروں پر سہرا باندھ دیا جائے۔ عبدالقیوم تو ویسے ہی اب گھر پر ریٹائر زندگی گزار رہا تھا۔ ان دونوں کی عملی زندگی کے بعد اب اس کی شدید خواہش تھی کہ اکبر علی کی بہو گھر لے آئے۔ اس سلسلے میں اس نے اپنے چند جاننے والوں سے رابطہ بھی کیا تھا۔ اکبر علی کو ان کی اس خواہش کا اس وقت علم ہوا' جب ایک روز عبدالقیوم کے ایک عزیز دوست ناصر علیم اور ان کی بیگم رات کے کھانے پر ان کے گھر آئے۔

ناصر کے جانے کے بعد عبدالقیوم نے اپنے دونوں بیٹوں سے کہا تھا:

''بیٹے! اب اس گھر میں بھی رونق ہونی چاہیے...... اور یہ رونق بہو سے ہی آئے گی...... آخر ہم کب تک رحمت بی کے ہاتھوں کا پکا ہوا کھاتے رہیں گے......'' انہوں نے ملازمہ کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھ کر کہا تھا۔

رحمت بی...... ایک لحاظ سے اس گھر کے فرد کی حیثیت اختیار کر گئی تھی...... کلثوم کے بعد اس نے اس گھر کو اچھی طرح سنبھال لیا تھا اور دونوں بچوں کو کسی قسم کی کمی محسوس نہ ہونے دی تھی۔

''ہاں بیٹا...... اب تو میری بوڑھی ہڈیاں بھی جواب دیتی جارہی ہیں۔'' رحمت بی نے اکبر علی کی طرف دیکھا تھا۔

''ابو...... آپ اصغر کی شادی کردیں......!'' اکبر نے قدرے ہچکچاتے ہوئے اپنے والد سے کہا تھا۔

''کیوں...... یہ کیسے ہوسکتا ہے...... پہلے بڑا...... اس کے بعد چھوٹا......'' عبدالقیوم نے اسے تعجب سے کہا تھا۔

''میں فی الحال شادی نہیں کرنا چاہتا......'' اکبر علی نے اسی لہجے میں ان سے کہا تھا۔

''بیٹا...... کہیں...... کوئی؟'' رحمت بی نے اس کی طرف ہنستی ہوئی آنکھوں سے دیکھا تھا۔

''جی بوا...... آپ ایسا ہی سمجھ لیں......!'' اکبر علی نے ان کے الفاظ کی تصدیق کرتے ہوئے کہا تھا۔

''کون ہے...... کہاں رہتی ہے......؟'' عبدالقیوم نے بڑی سنجیدگی سے سوال کیا تھا۔

''ہمارے کنٹری منیجر رضوان صاحب کی بیٹی رابعہ...... ہمارے ہی دفتر میں کام کرتی ہے......!'' اکبر علی نے سر جھکاتے ہوئے جواب دیا تھا۔

''ٹھیک ہے...... میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔'' عبدالقیوم نے کچھ سوچتے ہوئے اس سے کہا۔
''میں بہت جلد آپ کو اس سے ملواؤں گا ابو......'' اکبر علی نے کہا تھا۔
اس کے بعد اس موضوع پر کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ جبکہ اصغر نے اپنے والد کے چہرے پر تردد کی لکیریں دیکھ لی تھیں۔
ایک ہفتے بعد ہی اکبر اسے اپنے گھر لے آیا تھا۔ رابعہ کے حلیے سے ہی معلوم ہو رہا تھا کہ اس کے گھر کا ماحول کیسا ہو گا۔ نہایت چست لباس اور وہ بھی ایک پٹی نما دوپٹے کے ساتھ...... اونچی ایڑی کی سینڈل، ہاں ایک بات ضرور تھی...... وہ یہ کہ اس نے نہایت ہی ہلکا میک اَپ کر رکھا تھا اور زیورات کے نام پر صرف ایک لاکٹ گلے میں پہن رکھا تھا جو اس کے کھلے گریبان سے صاف نظر آتا تھا۔
''ہیلو انکل......'' اس نے سلام کے بجائے صرف ہیلو کہا تھا جو اس کے ماحول اور تربیت کا نتیجہ تھا۔
رابعہ میں کوئی برائی نہ تھی...... اور اکبر اس کا سب سے بڑا بیٹا تھا...... منتوں، مرادوں سے پیدا ہونے والا...... بھلا وہ اس کی خواہش کو کس طرح نظرانداز کر سکتا تھا۔
پھر وہی ہوا...... جو اکبر نے چاہا...... رابعہ اس گھر کی دلہن بن کر آ گئی...... پھر وہ بھی ہو گیا جو عبدالقیوم نے صرف سوچا ہی تھا...... اس کا اندازہ سو فیصد درست ثابت ہوا تھا۔
اکبر کی شادی کو ابھی چھ دن ہی تو ہوئے تھے۔
اس رات کھانے پر گفتگو کا سلسلہ اکبر علی نے شروع کیا تھا۔ ''ابو...... ! ایک بات کہنا تھی...... !'' اس نے قدرے ہچکچا کر کہا۔
''ہاں بولو...... !'' عبدالقیوم نے نوالہ چباتے ہوئے کہا۔
''ابو...... میں چاہتا ہوں کہ اب ہم نئے گھر میں شفٹ ہو جائیں...... !'' اس نے کچھ سوچ کر کہہ ہی دیا۔
''ہم کون......؟'' انہوں نے کھانے سے ہاتھ روک لیا تھا۔
''ہم...... سب لوگ...... !'' اکبر علی نے جواب دیا۔
''کیوں...... اس گھر میں کیا برائی ہے؟'' عبدالقیوم نے کڑی نگاہوں سے اسے دیکھا تھا۔
''یہ گھر چھوٹا ہے...... ڈیڈ...... دم گھٹتا ہے میرا اس میں۔'' رابعہ نے پہلی مرتبہ گفتگو میں حصہ لیا تھا۔ اسے

احساس ہوگیا تھا کہ جو بات وہ کہہ گئی ہے اُسے اکبر کبھی نہ کہہ سکتا تھا۔

''ہم نے تو ساری زندگی گزاردی ہے...... ہمارا دم تو نہیں گھٹتا' ہم بھی تو انسان ہی ہیں نا......'' عبدالقیوم کی آواز بھرا گئی تھی۔

''بس ڈیڈ...... ہم نے ساری سیٹنگ کرلی ہے...... یہاں سے ہم کچھ نہیں لے جائیں گے...... ڈیڈی نے فرنشڈ گھر گفٹ کیا ہے ہمیں......!'' رابعہ نے کہا۔

''تمہیں گفٹ کیا ہے ناں...... تو تم لوگ چلے جاؤ...... میں یہیں رہوں گا۔'' عبدالقیوم نے حتمی لہجے میں کہا۔

''ابو...... جذباتی نہ ہوں...... ذرا ٹھنڈے دل سے سوچ لیں' ہم بعد میں شفٹ ہوجائیں گے۔'' اکبر علی نے ان کے غصے کو ٹھنڈا کرنے کے لیے کہا۔

''نہیں بیٹا...... بعد میں بھی تم لوگ جاؤ گے...... لہٰذا ابھی چلے جاؤ...... میری طرف سے اجازت ہے تم لوگوں کو......!'' عبدالقیوم نے کہا اور کھانا کھائے بغیر ہی اُٹھ کر چلے گئے۔ ان کے ساتھ ہی اصغر بھی اُٹھ گیا تھا۔

''کیا ہوا...... کھانا تو کھالو......'' اکبر نے اس سے کہا۔

''کھالیا بھائی جان......!'' اصغر نے جواب دیا۔

اکبر اور رابعہ نے اطمینان سے کھانا کھایا تھا گویا ان کے نزدیک اس معاملے کی کوئی اہمیت ہی نہ تھی۔

اگلے دن پھر اکبر نے اس معاملے پر بات کرنا چاہی تھی لیکن عبدالقیوم نے صاف منع کردیا تھا۔ مسلسل تین روز تک یہ معاملہ چلتا رہا...... آخر وہی ہوا...... جو ہونا چاہیے تھا...... اکبر علی اپنی بیوی رابعہ کے ساتھ چلا گیا تھا...... جانے سے پہلے اس نے اصغر علی سے کہا تھا کہ وہ ان کے گھر ضرور آئے' وہ اپنے مکان کا فون نمبر بھی دے گیا تھا۔

شروع شروع میں اکبر اور رابعہ اپنی نئی کار میں ان سے ملنے کے لیے ہر تیسرے چوتھے روز آتے رہے پھر یہ آنا کم ہوگیا گیا...... اب صرف سال میں دو یا تین مرتبہ ہی چکر لگاتے تھے۔ دو سال بعد عبدالقیوم نے اپنے دوست کی بیٹی رقیہ سے اصغر علی کی بات پکی کردی اور اسے اپنی بہو بنا کر گھر لے آیا۔ وہ گھر جو پہلے سائیں سائیں کرتا تھا' اب واقعی گھر لگنے لگا تھا...... رقیہ نے بہت خدمت کی تھی...... آخر ایک روز عبدالقیوم بھی ان سب کو سوگوار چھوڑ کر چلا گیا۔ ان دنوں اکبر اور رابعہ شہر سے باہر تفریحی دورے پر گئے ہوئے تھے۔ واپسی پر ایک گھنٹے کے لیے اکبر افسوس کرنے آیا تھا اور بس......!

کچھ عرصے بعد اصغر کو عبدالقیوم کی الماری سے کاغذات کی چند فائلیں ملیں ٗ ان میں اس پلاٹ کے کاغذات بھی تھے جو عبدالقیوم نے بہت عرصہ پہلے نہایت سستے داموں خرید لیا تھا ٗ اس پلاٹ کے گرد اب کثیر منزلہ فلیٹس تعمیر ہو چکے تھے...... گلشن میں واقع اس پلاٹ کی قیمت اب آدھے کروڑ کے لگ بھگ تھی...... جس دن اصغر نے وکیل سے مشورہ کیا اور کے ڈی اے میں اس کی فائل تصدیق کے لیے دی ٗ نہ جانے کیسے اکبر علی کو بھی اس پلاٹ کی خبر مل گئی اور پھر وہ اس کے سامنے آ گیا۔

''اس پلاٹ پر تمہارا کوئی حق نہیں ہے......!'' اکبر نے اصغر سے واضح الفاظ میں کہہ دیا تھا۔

''کیوں......؟'' اصغر نے اس سے مرعوب ہوئے بغیر پوچھا تھا۔

''اس لیے کہ میں بڑا ہوں...... یہ میرا حق ہے...... میں اگر چاہوں تو تمہیں اس میں سے حصہ دے دوں گا۔'' اکبر نے کہا تھا۔

''اس سے پہلے تم کہاں تھے...... تمہارے حقوق کہاں تھے......؟'' اصغر نے پوچھا۔

''بہرحال...... میں فضول بحث کرنا نہیں چاہتا...... تم فائل مجھے دے دو...... میں اس میں سے تمہارا حصہ دینے کو تیار ہوں۔''

اکبر نے نہ جانے کیا سوچ کر رضامندی ظاہر کی تھی۔

''سوری اکبر بھائی...... میں آپ کو فائل نہیں دے سکتا ٗ کیونکہ وہ اس وقت وکیل کے پاس ہے...... ویسے بھی اب میں آپ کو فائل نہیں دے سکوں گا۔'' اصغر نے دوٹوک جواب دیا تھا۔ وہ اکبر کی نیت بھانپ چکا تھا۔

''مجھے کل فائل چاہیے...... میں کل رات کو آؤں گا۔'' اکبر نے تمام رشتوں کو فراموش کر دیا تھا۔ وہ بکتا جھکتا چلا گیا۔

اصغر سر پکڑ کر بیٹھ گیا تھا۔ اسے بالکل بھی اندازہ نہ تھا کہ اکبر اس طرح کا طرزِ عمل اختیار کرے گا۔



''بڑا دلچسپ کیس آیا ہے۔'' شرجیل نے دفتر میں موجود ممبران کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''سارے ہی کیس نہ صرف دلچسپ ہوتے ہیں بلکہ عجیب بھی ہوتے ہیں ٗ پھر بھلا یہ کیس......!'' شوکی نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا تھا۔ کیونکہ شگفتہ نے اسے گھور کر دیکھا تھا۔

''ہاں تو شرجیل تم کس کیس کے متعلق بتا رہے تھے۔'' شگفتہ نے شرجیل سے کہا۔

''ہاں......! یہ اس لحاظ سے دلچسپ ہے کہ اس میں شوکت کے کرنے کے لیے کوئی کام نہیں ہے...... کیونکہ یہ جائیداد کا معاملہ ہے۔!'' شرجیل نے کہا۔

''یہ تو تمہارا عدالتی معاملہ ہے...... اس میں کسی دوسرے کا کوئی کام نہیں ہے!'' شگفتہ نے کہا تو شوکت مسکرانے لگا۔

''اچھا ذرا کیس کی تفصیلات تو سن لو......'' شرجیل نے اس کی طرف ملتجیانہ نظروں سے دیکھا تھا۔

''ہاں بولو......!'' اس مرتبہ شوکت نے کہا تھا۔

شرجیل کے بیان کے مطابق اکبر علی چاہتا تھا کہ گلشن میں واقع وہ پلاٹ جو اس کے والد کی ملکیت تھا' کسی طریقے سے اسے مل جائے' کیونکہ اس کمرشل پلاٹ کی قیمت آس پاس کثیر المنزلہ عمارتوں کی تعمیر کی وجہ سے پچاس لاکھ سے تجاوز کر چکی تھی۔ اکبر علی اس پر تجارتی مرکز تعمیر کرنا چاہتا تھا جبکہ اصغر علی کا کہنا تھا کہ چونکہ اکبر انہیں چھوڑ کر جا چکا تھا لہٰذا اول تو اس پلاٹ پر کوئی حق نہیں رکھتا لیکن وہ قانونی لحاظ سے اس کی تقسیم پر راضی ہے...... دوسرا دلچسپ پہلو یہ تھا کہ اصغر نے جس وکیل سے اپنے مقدمے کے سلسلے میں بات کی تھی' اسے کبر علی نے ٹھیک ٹھاک رقم کی پیشکش کی تھی لیکن وہ اس بات پر ہرگز راضی نہ ہوا کہ وہ اپنے منصب کے برخلاف کوئی کام کرے۔ حالانکہ وہ ایک معمولی سا وکیل ہے۔ اس وجہ سے اکبر علی نے سوچا تھا کہ شاید وہ بھاری رقم کے لالچ میں پھسل جائے لیکن ایسا نہیں ہوا...... اس کے بعد اکبر نے اپنی حیثیت کے مطابق شرجیل کی خدمات حاصل کی تھیں...... اس نے سنا تھا کہ اگر کوئی کیس شرجیل کے پاس آ جائے تو پھر اس کا جیتنا لازمی ہے...... خواہ وہ کسی بھی نوعیت کا ہو۔

ایک لحاظ سے یہ بھی شرجیل کی پالیسی کا حصہ تھا۔ اس نے یہ بات خود ہی مشہور کرا دی تھی۔ تاکہ حق دار کی حق تلفی نہ ہو سکے۔ اس سلسلے میں مددگار لمیٹڈ کی ٹیم اس کی معاون ہوتی تھی۔ خاص طور پر شگفتہ...... جو بحیثیت صحافی اس معاملے کی کھوج نہایت آسانی سے لگا لیتی تھی...... پھر شوکت تھا...... بھورے ماموں تھے...... بھورے ماموں بھی خوب تھے...... ان کے ذمے ہمیشہ ایسا کام سونپا جاتا تھا جہاں وہ آسانی سے کام کر سکیں...... فی الحال ان کی ضرورت بہت کم محسوس کی جاتی تھی...... ہاں البتہ شوکت اور شگفتہ تقریباً ہر معاملے میں ملوث ہوتے تھے...... پھر بھلا اس معاملے میں ان کے لیے کوئی کام کیوں نہ نکلتا...... اب شرجیل اصل معاملے کی طرف آ رہا تھا۔

''سب سے پہلے تم دونوں کو اس معاملے کی تحقیق کرنا ہے۔۔۔۔۔۔'' شرجیل نے تمام معاملہ سمجھانے کے بعد ان دونوں سے مخاطب ہو کر کہا تھا۔

''ابھی تو تم کہہ رہے تھے کہ۔۔۔۔۔۔!'' شوکت نے اس کی طرف حیرت سے دیکھا تھا۔

''محض مذاق تھا۔۔۔۔۔۔'' شرجیل نے ہنستے ہوئے کہا: ''لیکن یہ مذاق نہیں ہے۔۔۔۔۔۔ میں سنجیدہ ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔۔۔۔۔۔ کام بتاؤ۔۔۔۔۔۔'' شگفتہ بھی سنجیدہ ہو گئی تھی۔ پھر شرجیل ان دونوں کو کام بتانے لگا۔



''رقیہ۔۔۔۔۔۔ میں آج جلدی آجاؤں گا۔'' اصغر علی نے صبح ناشتہ کرتے ہوئے اپنی بیوی سے کہا۔

''کیوں خیریت۔۔۔۔۔۔ آج دفتر جانے کا ارادہ نہیں ہے کیا۔۔۔۔۔۔؟'' رقیہ نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا تھا۔

''ہاں۔۔۔۔۔۔! میں پہلے تو کے ڈی اے آفس جاؤں گا۔۔۔۔۔۔ وہاں سے فائل کی تصدیق کرانی ہے۔۔۔۔۔۔ پھر وکیل کے پاس جاؤں گا۔۔۔۔۔۔ تاکہ کیس کی فائل بنوائی جائے۔۔۔۔۔۔'' اصغر نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا تھا۔

''میں تو کہتی ہوں۔۔۔۔۔۔ اس جھنجٹ میں نہ پڑو۔۔۔۔۔۔ دفع کرو۔۔۔۔۔۔ وے دو انہیں زمین کے کاغذات۔۔۔۔۔۔ ہمارے لیے یہی دو کمروں کا کوارٹر بہت ہے۔۔۔۔۔۔'' رقیہ نے اسے سمجھایا۔

''نہیں رقیہ۔۔۔۔۔۔ تم نہیں سمجھو گی۔۔۔۔۔۔ اگر وہ بڑے بھائی کی حیثیت سے مجھ سے زندگی بھی مانگتے تو میں دے دیتا۔۔۔۔۔۔ لیکن وہ تو ہٹ دھرمی پر اتر آئے ہیں۔۔۔۔۔۔ پھر ہمارا بھی قانونی حق ہے۔۔۔۔۔۔ میں بھی وارث ہوں۔۔۔۔۔۔ کوئی بھی چیز میں برابری کی بنیاد پر تقسیم کرنے کو تیار ہوں۔۔۔۔۔۔ میں نہیں چاہتا کہ کسی بھی معاملے میں ناانصافی ہو۔۔۔۔۔۔ میں قانونی طور پر اس کی تقسیم چاہتا ہوں اور بس۔۔۔۔۔۔'' اصغر نے اسے جواب دیا۔

''اگر وہ نہ مانے تو۔۔۔۔۔۔ ویسے بھی وہ حیثیت میں ہم سے بڑے ہیں۔۔۔۔۔۔'' رقیہ نے خدشہ ظاہر کیا۔

''وہ صرف عمر اور مرتبے میں بڑے ہیں۔۔۔۔۔۔ حیثیت سب کی برابر ہے۔۔۔۔۔۔ بہر حال اب تو یہ قانونی طور پر ہی طے ہو گا کہ کس کو کیا ملے گا۔۔۔۔۔۔ میں چلتا ہوں۔'' اصغر نے اُٹھ کر باہر کی طرف قدم بڑھائے۔

''اللہ حافظ۔۔۔۔۔۔'' اصغر نے باہر نکلنے کے بعد کہا تھا۔

وہ بس اسٹاپ پر آیا اور وہاں سے سوک سینٹر جانے والی کوچ میں سوار ہو گیا۔

دس بجے وہ سوک سینٹر میں تھا۔ مین برانچ میں پہنچ کر اس نے کلرک کو کاغذات کی رسید دکھائی۔ کلرک نے

اسے ایک طرف بیٹھنے کا اشارہ کیا اور چپراسی کے ہاتھ وہ رسید اندر بھجوادی۔ تھوڑی دیر کے بعد چپراسی ایک فائل لے کر آ گیا۔ کلرک نے اسے کھول کر دیکھا...... دو چار صفحات پلٹے...... رسید کو دیکھا اور پھر اس نے حیرت سے اصغر علی کی طرف دیکھا...... اصغر اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کو دیکھ رہا تھا...... وہ اُٹھا اور کلرک کے سامنے پہنچ گیا۔

''کوئی مسئلہ ہے کیا......'' اس نے پوچھا۔

''نہیں...... مسئلہ تو نہیں ہے لیکن آپ کو اصل فائل لے کر آنا ہوگا...... یا پھر آپ فائل کی تصدیق شدہ فوٹو کاپی لے آئیں، ہم اسی پر آپ کو تصدیق کر کے دے دیں گے۔'' کلرک نے اسے بتایا۔

''بہتر ہے جناب...... کوئی خدمت......؟'' اصغر نے اس سے پوچھا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ سرکاری محکموں میں ''خدمت'' کے بغیر کوئی کام نہیں ہوتا۔

''ارے جناب...... ہم آپ کی خدمت کے لیے بیٹھے ہیں، بس آپ تکلیف کریں اور فائل لے آئیں۔'' کلرک نے بڑے انکسار سے کہا۔ اس پر اصغر کو تعجب بھی ہوا تھا۔

''بہتر ہے...... میں کل حاضر ہو جاؤں گا۔'' اصغر نے اپنی دی ہوئی رسید اس سے واپس لی اور دفتر سے باہر آ گیا۔ سوک سینٹر کی پارکنگ کے پاس ہی چائے کی کینٹین تھی، اسے چائے کی طلب ہوئی تو وہ وہاں آ گیا اور ایک لکڑی کی بینچ پر بیٹھ گیا۔ اس نے اشارے سے چائے کا کہہ دیا تھا۔ اس نے تازہ اخبار اُٹھایا اور پڑھنے لگا۔ اتنے میں ایک لڑکے نے چائے کا کپ اس کے سامنے رکھ دیا تھا۔

چائے پینے کے بعد اس نے ادائیگی کی اور پیدل چلتا ہوا بس اسٹاپ پر آ گیا۔ اسے یہاں سے سٹی کورٹ جانا تھا جہاں وکیل کا دفتر تھا۔ جس وقت وہ کوچ میں لٹک کر جا رہا تھا اس کی نظر ایک سرخ شیراڈ پر پڑی تھی، جس کی ڈرائیونگ سیٹ پر اکبر علی بیٹھا تھا، وہ سگنل بند ہونے کی وجہ سے سب سے آگے تھا اور اس کا رخ سوک سینٹر کی طرف تھا۔

'شاید اپنے گھر جا رہا ہے۔' اصغر علی نے سوچا۔ کیونکہ اکبر کا بنگلہ گلستانِ جوہر میں تھا۔ اس نے کوئی خاص بات نہ سمجھ کر اسے ذہن سے جھٹک دیا تھا۔



''ناصر صاحب کورٹ گئے ہیں...... آدھے گھنٹے بعد آئیں گے۔'' کاؤنٹر پر موجود لڑکے نے اصغر سے کہا تھا۔

اصغر نے گھڑی دیکھی ...... ساڑھے گیارہ بج رہے تھے...... بارہ بجے ناصر قریشی دفتر میں داخل ہوئے تو اصغران کا انتظار کر رہا تھا۔ ’’آیئے...... اصغر صاحب...... اندر آجائیں۔‘‘

اصغران کے پیچھے پیچھے ان کے کمرے میں چلا آیا تھا۔

’’جی کیا ہوا......؟‘‘ کرسی پر آرام سے بیٹھنے کے بعد ناصر قریشی نے اس سے پوچھا۔

’’کلرک کا کہنا ہے کہ تصدیق شدہ فوٹو کاپی یا اصل فائل لائی جائے‘ اس کے بعد وہ تصدیق نامہ جاری کریں گے۔‘‘ اصغر نے بتایا۔

’’پوری فائل کی ضرورت تو نہیں ہے...... حالانکہ الاٹمنٹ آرڈر کی فوٹو کاپی تو آپ نے جمع کرائی تھی...... بہرحال...... ممکن ہے سٹی گورنمنٹ کے تحت قاعدہ تبدیل ہو گیا ہو۔ میں آپ کو فائل کی فوٹو کاپی کرا کے دیتا ہوں۔‘‘ ناصر قریشی نے بیل کو بٹن دبایا تو باہر کاؤنٹر پر بیٹھا لڑکا اندر کے کمرے میں آ گیا۔

’’جی سر......؟‘‘ اس نے پوچھا

’’بیٹا...... الماری سے اصغر صاحب کی فائل نکالو اور فوٹو کاپی کرا کے لے آؤ...... ذرا جلدی سے...... اور ہاں...... ذرا اچھی سی چائے کا بھی کہہ دینا۔‘‘

لڑکا ’جی سر‘ کہتا ہوا باہر چلا گیا۔

پندرہ منٹ بعد چائے والے کے ساتھ ساتھ وہ لڑکا بھی آ گیا تھا۔ اس نے ایک ہاتھ میں فائل اور دوسرے میں فوٹو کاپیوں کا پلندہ پکڑا ہوا تھا۔ کاغذ کا پلندہ اس نے ناصر قریشی کے سامنے رکھ دیا اور فائل لے کر چلا گیا تھا۔

ناصر قریشی نے تمام کاغذ ترتیب سے رکھے اور پھر بیل بجائی۔

’’یہ فائل میں لگا دو...... بلکہ پہلے چائے ڈالو...... ٹھنڈی ہو رہی ہے۔‘‘ کاغذات فائل میں لگانے کے بعد اس نے تمام پر تصدیق کی مہر لگائی اور دستخط کرنے کے بعد اصغر کی طرف بڑھا دی۔

’’کل آپ جمع کرائیں گے تو پھر پرسوں اس کی تصدیق بھی ہو جائے گی۔ میں ان دو دنوں میں وراثت کے کاغذات بھی مکمل کر لوں گا...... ویسے ایک بات کہوں اصغر بھائی۔‘‘ ناصر قریشی نے قدرے اپنائیت سے اسے مخاطب کیا تھا۔

’’جی ناصر صاحب...... کہیے......؟‘‘ اصغر نے کہا۔

”یہ آپ کا ہی دل گردہ ہے..... ورنہ تو لوگ پورا مال ہی ہڑپ کرنے کے چکر میں رہتے ہیں۔“ ناصر قریشی نے کہا تو اصغر نے صرف مسکرانے پر ہی اکتفا کیا تھا۔

”اچھا ناصر صاحب..... انشاء اللہ پرسوں ملاقات ہوگی۔“

اصغر نے اس سے ہاتھ ملایا اور اس کے دفتر سے باہر آ گیا۔ بس اسٹاپ سے وہ فائیو سی کی بس میں چڑھ گیا تھا۔ اس کا رُخ جہانگیر کوارٹر کی طرف تھا جہاں دوپہر کے کھانے پر رقیہ اس کا انتظار کر رہی تھی۔

☆☆

”جی فرمایئے؟“ استقبالیہ کاؤنٹر پر بیٹھی خوبصورت سی لڑکی نے شگفتہ کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھ کر پوچھا تھا۔

”رضوان ایم برنی صاحب تشریف رکھتے ہیں.....؟“ شگفتہ نے نرم لہجے میں پوچھا تھا۔

”جی ہاں.....!“ لڑکی نے سوالیہ انداز سے پوچھا۔

”میں ان سے ملنا چاہتی ہوں۔“ شگفتہ نے اپنا وزیٹنگ کارڈ اس کی طرف بڑھایا۔

”سوری مس.....“ لڑکی نے کارڈ پڑھتے ہوئے کہا:

”آپ کو ان سے ملنے کے لیے پہلے وقت لینا پڑے گا۔“ لڑکی نے عاجزانہ لہجے میں جواب دیا۔ وہ اس سے مرعوب ہو چکی تھی۔

شگفتہ بحیثیت صحافی رضوان صاحب سے انٹرویو کرنے کے لیے ناران انٹرپرائزز کے دفتر میں آئی۔ رضوان ایم برنی..... اکبر علی کے سسر تھے۔ ان کی کمپنی مختلف شعبوں میں کام کرتی تھی اور ان تمام شعبوں کا مرکزی دفتر ناران انٹرپرائزز تھا۔

دس سال قبل تک رضوان صاحب ایک بین الاقوامی ادویات کے دفتر میں کام کرتے رہے..... پھر انہوں نے اپنی کمپنی کی بنیاد ڈالی..... یہ ایک فارماسیوٹیکل کمپنی ہی تھی جو مقامی طور پر مختلف ادویات تیار کرتی تھی۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے ان کی کمپنی ترقی کی منازل طے کرتی گئی اور اب ایک مستحکم حیثیت رکھتی تھی۔ اس کے علاوہ انہوں نے اپنی بیٹی رابعہ کے پیار کے نام ”پنکی“ کے حوالے سے تعمیرات کی دنیا میں کئی پروجیکٹ بھی دیے تھے.....لوگ ناران انٹرپرائزز کے پنکی اپارٹمنٹ، پنکی ٹاور اور نہ جانے کیا کیا..... پر اعتماد کرتے تھے۔ اس لحاظ سے رضوان صاحب ایک اچھی خاصی حیثیت اور شہرت کے مالک تھے۔

''اچھا...... اکبر صاحب سے ملاقات ہوسکتی ہے؟'' شگفتہ نے اس سے پوچھا۔

''ہاں ہوتو سکتی ہے...... لیکن...... ان سے معلوم کرنا پڑے گا۔'' لڑکی نے قدرے تذبذب سے کہا۔

''ان سے ہی ملوادیں پلیز......'' شگفتہ نے التجائیہ انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔

''بہتر...... آپ تشریف رکھیں...... میں ان سے بات کرتی ہوں۔'' لڑکی نے سامنے کی سیٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس سے کہا۔ لڑکی نے انٹر کام پر اکبر علی سے بات کی' اسے شگفتہ کے متعلق بتانے کے بعد وہ دوسری جانب سے کہی جانے والی باتیں سننے لگی۔

''بہتر سر......'' اس نے ریسیور رکھ دیا۔ پھر اس نے ایک بٹن دبایا اور انتظار کرنے لگی۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک لڑکا آ گیا۔ ''بشیر...... میڈم کو اکبر صاحب کے پاس لے جاؤ۔'' اس نے لڑکے سے کہا۔

شگفتہ نے اپنا پرس اور کٹ بیگ اُٹھالیا۔ وہ پوری تیاری کے ساتھ آئی تھی۔ اس کا ارادہ تھا کہ وہ رضوان صاحب سے ملاقات کر کے اس کے آئندہ پروجیکٹ کے بارے میں معلومات کرے گی لیکن اب وہ اکبر علی سے ملنے جارہی تھی۔ وہ مکمل خاکہ پہلے سے ہی تیار کر کے چلی تھی۔

''تشریف رکھیں......'' اکبر علی نے اسے اپنے دفتر میں ایک طرح سے خوش آمدید ہی کہا تھا۔

''شکریہ......'' شگفتہ نے اپنا پرس اور کٹ بیگ اپنے برابر کی کرسی پر رکھا اور اپنا وزیٹنگ کارڈ اس کی طرف بڑھا کر کرسی پر بیٹھ گئی۔

''جی شگفتہ صاحبہ...... میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں۔'' اکبر علی نے کاروباری مسکراہٹ سے پوچھا۔

''میں ان دنوں تعمیراتی پروجیکٹس کے بارے میں فیچر تیار کررہی ہوں......'' شگفتہ نے تمہید باندھی۔ ''اور ...... اس سلسلے میں تمام بڑی کمپنیوں سے معلومات جمع کررہی ہوں۔''

''میں آپ کو زیادہ وقت نہ دے سکوں گا۔'' اکبر نے کہا۔

''کوئی بات نہیں...... میں آپ کا زیادہ وقت لوں گی بھی نہیں' بس مجھے تو چند ضروری معلومات درکار ہیں۔'' شگفتہ نے گویا اپنا انٹرویو شروع کردیا تھا۔

پھر اس نے چند ضروری باتوں کے علاوہ ان کے آئندہ پروجیکٹ کے بارے میں سوال کیا۔

''ویسے تو یہ ہمارا بزنس سیکرٹ ہے...... لیکن بہرحال میں آپ کو بتائے دیتا ہوں۔'' اکبر نے اسے اپنے

تین شروع کیے جانے والے پروجیکٹس کے بارے میں بتایا اور پھر پوچھا۔

''اور مزید کچھ......؟'' گویا یہ اشارہ تھا کہ اس سے زیادہ وہ مزید وقت نہیں دے سکتا۔

''تھینکس ......میں آپ کی بے حد ممنون ہوں اکبر صاحب۔'' شگفتہ نے اپنا سامان سمیٹنا شروع کیا اور پھر اس سے اجازت لے کر وہاں سے باہر آگئی۔ اس کا اصل مقصد پورا ہو چکا تھا۔



اصغر علی کا ذہن چکرا رہا تھا...... زمین اس کے پیروں تلے سے کھسکتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی...... بات ہی کچھ ایسی تھی۔ اس کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے...... بھلا ایسا کیسے ممکن ہے......؟ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کو تھام لیا تھا۔

وہ ٹھیک دس بجے کے ڈی اے ریکارڈ روم میں پہنچ گیا تھا۔ کلرک نے اسے آج ہی بلایا تھا۔ دو دن قبل وہ فائل جمع کرانے کے بعد رسید لے گیا تھا۔ تصدیق شدہ فائل کے لیے اسے آج بلایا گیا تھا۔

رسید لینے کے بعد کلرک نے بڑی عجیب نظروں سے اسے دیکھا تھا...... پھر گویا اس نے بم دھماکا کیا تھا۔

''فائل آپ کی ہے یا آپ اسے خرید رہے ہیں؟'' کلرک نے اس سے دریافت کیا تھا۔

''میری اپنی فائل ہے...... کیوں خیریت......'' مسکراتا ہوا اصغر سنجیدہ ہو گیا تھا۔

''آپ کے پاس دو نمبر فائل ہے......'' کلرک نے کہا تھا۔

''کیا مطلب...... میں سمجھا نہیں......!''

''دو نمبر کا مطلب ہوتا ہے نقلی...... جعلی...... آپ کے پاس جعلی فائل ہے...... اب سمجھے آپ......؟'' کلرک نے طنزیہ انداز سے اس کی طرف دیکھا تھا۔

''لیکن یہ کیسے ممکن ہے؟...... میرے پاس کے ڈی اے کے اصل کاغذات ہیں...... اور فائل بھی آج کی نہیں ہے......'' اکبر علی نے پریشانی سے کہا تھا۔

''ارے جناب...... دو نمبر فائل بنانے والے بھی کم ہوشیار نہیں ہوتے...... یا تو آپ بے وقوف بن گئے ہیں یا پھر بنا رہے ہیں...... بہر حال ہمارا کام ہی یہی ہے کہ اصل اور نقل میں فرق بتا دیں...... اور کوئی خدمت......؟'' کلرک نے عجیب سی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

''شکریہ......'' اصغر علی کے قدم لڑکھڑا رہے تھے......اس کے پیروں تلے سے زمین کھسک گئی تھی یہ سب سن کر......اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے......وکیل......ہاں......یہ سب اس وکیل کا کیا دھرا ہے......حالانکہ اس کی گفتگو اور رویے سے ایسا لگتا نہیں ہے......!

وہ اسی طرح حواس باختہ ریکارڈ روم سے باہر آیا اور پھر تیزی سے بس اسٹاپ پر پہنچا۔ اب اس کا رُخ سٹی کورٹ کی طرف تھا' جہاں ناصر قریشی کا دفتر واقع تھا۔



''میں پہلے ہی کہتی تھی کہ جان چھڑالو اس مصیبت سے......مگر پتا نہیں تمہارے دماغ میں کیا سمائی تھی......مانتی ہوں کہ تمہارا بھائی ہے مگر خودغرض......مطلبی......اس کے اندر حرص نے ڈیرے ڈال رکھے ہیں۔'' رقیہ رو رہی تھی۔

''قانون بھی بااثر لوگوں کا ساتھ دیتا ہے......اب بھلا میں کیا کرسکتا ہوں......؟'' اصغر علی نے بے چارگی سے کہا۔

جس وقت اصغر اپنے وکیل ناصر قریشی کے دفتر پہنچا تھا' وہاں پولیس کے چار افراد موجود تھے' پورا دفتر کباڑ خانے کی شکل پیش کر رہا تھا۔

ناصر قریشی باہر ہی موجود تھا۔ اسی سے معلوم ہوا کہ رات کے کسی پہر اس کے دفتر میں چوری ہوئی ہے۔ اب چور کو کیا ملا......اور وہ کیا لے گیا......فی الحال اس کا پتا چلنا مشکل تھا۔ ایسی صورتِ حال میں بھلا وہ ناصر قریشی پر کیا غصہ اتارتا' بس اسے صورتِ حال بتا کر چلا آیا تھا۔

''اس میں کم از کم دو روز لگ جائیں گے......میں پہلی فرصت میں آپ کی فائل تلاش کر کے اصل معاملے کا پتا چلاتا ہوں۔ آپ میری مجبوری کا کچھ خیال کرلیں......'' ناصر نے حد درجے بے چارگی سے اس سے درخواست کی تھی۔

دو دن اس نے کانٹوں کے بستر پر بسر کیے تھے۔ تیسرے روز وہ ناصر کے دفتر پہنچا تو وہ اسی کا منتظر تھا۔ اس نے تمام چیزیں ترتیب سے رکھ لی تھیں۔

''آپ کی فائل سے تین پیپر غائب ہیں......میں نے تمام فائلوں میں دیکھ لیا ہے......فالتوں کاغذوں کے ڈھیر میں بھی تلاش کرچکا ہوں......'' ناصر نے اس سے کہا تھا۔

''اس کا مطلب ہے؟'' اصغر علی نے اس سے پوچھا تھا۔

''اس کا مطلب تو واضح ہے اصغر صاحب اور اب میں آپ کو وہ بات بھی بتا دوں جو میں نے آپ سے چھپائی تھی......!'' ناصر قریشی نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

''وہ کیا......؟'' اصغر نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ''آپ کے بھائی اکبر علی میرے پاس آئے تھے...... یہ کافی دن پہلے کا واقعہ ہے......!''

''کیوں...... وہ کیا چاہتے تھے؟'' اصغر نے چونک کر پوچھا۔

''وہ اس فائل کی منہ مانگی قیمت دینا چاہتے تھے...... لیکن میں نے منع کر دیا......!'' ناصر نے اصل حقیقت بیان کی۔

''لیکن ایک بات سمجھ میں نہیں آئی......!'' اصغر نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''کیا...... ایسی کون سی بات ہے؟'' ناصر نے تعجب سے پوچھا۔ ''ریکارڈ روم کے کلرک نے میری فائل کو دو نمبر کیوں بتایا...... جبکہ اس میں تمام کاغذات لگے ہوئے تھے...... وہ بھی...... جو چوری ہو گئے...... یا پھر غائب ہیں۔'' اصغر نے کہا۔

''ارے ہاں...... یاد آیا...... کیوں نہ ہم ریکارڈ روم سے اپنی فوٹو کاپی والی فائل واپس لے لیں اور پھر دیکھیں کہ اصل معاملہ کیا ہے؟'' ناصر نے قدرے جوش سے کہا تھا۔

''کیا ایسا ممکن ہے؟'' اصغر نے امید بھرے لہجے میں اس سے پوچھا۔ ''اصغر صاحب...... آپ فکر نہ کریں...... میں خود کوشش کرتا ہوں' اس کے علاوہ ایک راستہ اور بھی ہے...... میں ابھی ایک صاحب سے جا کر ملتا ہوں...... وہ ہماری مدد ضرور کریں گے......'' ناصر نے اچانک کہا جیسے اسے کچھ یاد آ گیا ہو۔

''کس سے...... کون ہے وہ......؟'' اصغر نے حیرت سے پوچھا تھا۔ ''ایڈووکیٹ شرجیل یار خاں...... میرے دوست اور محسن...... اور بہت کچھ......'' ناصر نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔



''وراثت کی منتقلی کے لیے آپ کو ثبوت دینا ہوں گے۔'' شرجیل نے اپنے دفتر میں اپنے سامنے بیٹھے ہوئے اکبر علی سے کہا۔

''آپ کو تو معلوم ہی ہے شرجیل صاحب...... ہمارے ہاں کوئی بھی کام ناممکن نہیں ہے...... بس ہر کام کی قیمت مقرر ہے...... میں نے پلان تیاری کے لیے دے دیا ہے...... بس پروجیکٹ کا اعلان باقی ہے...... جیسے ہی یہ معاملہ نمٹتا ہے...... میں اعلان کر دوں گا...... پھر آپ دیکھیے گا پنکی ٹریڈ سینٹر...... کی کیا اہمیت ہوگی!'' اکبر علی نے جوش میں کہا تھا۔

''کیا آپ کو اپنے بھائی کا بالکل بھی احساس نہیں ہے؟'' شرجیل اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لے رہا تھا۔

''آج کے دور میں ہر چیز پیسے میں تولی جاتی ہے...... یہ رشتے ناتے...... اصول...... ضابطے...... سب فرسودہ چیزیں ہیں آج کے دور میں کوئی کسی کا نہیں ہے شرجیل صاحب...... اگر آپ کے پاس پیسہ ہے تو سب کچھ آپ کا ہے...... ورنہ آپ تہی دست ہیں۔'' اکبر علی کی آنکھیں جوش میں چمک رہی تھیں۔

''ٹھیک ہے اکبر صاحب...... میں فائل تیار کرواتا ہوں...... آپ کاغذات تیار کروالیں...... تفصیل میں آپ کو بتا ہی چکا ہوں' دو روز بعد میں کاغذات جمع کرادوں گا...... پندرہ روز میں جائیداد منتقل ہو جائے گی۔'' شرجیل نے کہا۔

''بہتر ہے...... میں چلتا ہوں۔'' اکبر علی اس سے اجازت لے کر چلا گیا تھا۔

شرجیل میز پر پڑی ہوئی فائلوں میں الجھ گیا تھا۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد اس کی میز پر پڑے ہوئے انٹرکام کی بیل بجی' اس نے ریسیور اٹھا کر بات سنی اور کہا۔

''اندر بھیج دیں...... میں انہی کا انتظار کر رہا تھا۔''

تھوڑی دیر کے بعد اس کے سامنے ناصر قریشی بیٹھا تھا۔



وہ سفید شیراڈ صبح سے اس کے تعاقب میں تھی۔ بعض اوقات انسان اتنا بدمست ہوتا ہے کہ اسے بہت سی باتوں کا ہوش بھی نہیں رہتا۔

وہ بھی بدمست تھا...... اس کے ذہن پر کامیابی کا نشہ سوار تھا۔ اس نے جو چاہا تھا...... اسے مل گیا تھا...... خوبصورت، حسین بیوی...... اچھی اور پرکشش ملازمت...... اس کے بعد اس نے جس کام میں ہاتھ ڈالا...... وہ

ہو گیا...... لیکن اس معاملے میں وہ تذبذب کا شکار تھا...... ایک بہت بڑا کانٹا تھا' اس کے راستے میں...... مگر اب وہ بھی دور ہو گیا تھا۔ اتنا بڑا پروجیکٹ...... اس کے خواب و خیال میں بھی نہ تھا کہ وہ اتنا بڑا پروجیکٹ بھی کر سکتا ہے...... سوچا ضرور تھا...... پہلے کا حسین اور سنہرا خواب' اب تعبیر پا رہا تھا۔ وہ ہر وقت اسی کے متعلق سوچتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اپنے تعاقب سے بے خبر تھا۔

صبح سے اب تک وہ چار افراد سے مل چکا تھا۔ اس نے اصلی اور کھرے کام کے ٹھیک ٹھاک دام ادا کیے تھے۔ وہ اس معاملے میں کوئی سقم نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔

یہ کام وہ اپنے بندوں سے...... ملازموں سے بھی کروا سکتا تھا لیکن اس میں رازداری نہ رہتی...... یہی وجہ تھی کہ وہ یہ کام خود کر رہا تھا۔ اب اسے آخری آدمی سے ملنا تھا اور اس کے بعد کام ختم......!

جس وقت وہ اپنی کار سوک سینٹر کے پارکنگ لاٹ میں کھڑی کر رہا تھا۔ سفید شیراڈ بھی اس کے بالکل پیچھے آ کر رکی تھی۔

سفید شیراڈ میں شوکت تھا جو صبح سے اکبر علی کا تعاقب کر رہا تھا۔ اسے شرجیل نے تمام معاملہ سمجھا دیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ان تمام لوگوں کے متعلق معلومات اکٹھی کر رہا تھا جو اکبر علی کی اس کام میں معاونت کر رہے تھے۔

☆☆

''اصغر......!'' رقیہ نے گھبراہٹ میں اسے آواز دی تھی۔

''کیا ہے بھئی...... صبح ہی صبح کیوں شور مچا رہی ہو......!'' اصغر جو اس وقت باتھ روم سے باہر آیا تھا' بولا۔

''یہ اخبار دیکھ لو......'' رقیہ نے مقامی اخبار کا پہلا صفحہ اس کے سامنے کر دیا۔

''ناران انٹرپرائزز کے اکبر علی فراڈ کیس میں گرفتار۔''

وہ تیزی سے اس خبر کی تفصیل پڑھنے لگا۔ خبر کے مطابق اکبر علی نے گلشن میں جائیداد کی منتقلی کے جو کاغذات جمع کرائے تھے' ان میں پیش کیے جانے والے ثبوت جعلی تھے عدالت نے از خود یہ ایکشن لیا تھا۔ جس کورٹ میں اس جائیداد کی فائل پیش کی گئی تھی' اس کے جج کو ایک لفافہ موصول ہوا تھا' جس میں اکبر علی کے چند فوٹو گراف تھے ان فوٹو گرافس میں وہ مختلف لوگوں کو رقم کی ادائیگی کر رہا تھا اور ان سے مختلف سرٹیفکیٹس لے رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی تفصیل بھی تھی۔ عدالت نے اس سلسلے میں تحقیق کی تو متعلقہ افراد نے اپنا جرم قبول کر لیا تھا' جس کے

نتیجے میں عدالت نے ازخود کارروائی کے نتیجے میں اکبر علی کے وارنٹ گرفتاری جاری کر دیے تھے۔

''خس کم جہاں پاک......'' رقیہ نے تبصرہ کیا۔

''نہیں رقیہ...... وہ بے شک برا سہی...... لیکن بھائی ہے میرا...... خون کا رشتہ ہے اس سے...... میں اس سے ضرور ملوں گا۔'' اصغر علی نے کہا اور جلدی جلدی تیار ہونے لگا۔

''کہاں جاؤ گے؟'' رقیہ نے اس سے پوچھا۔

''اپنے وکیل کے پاس...... اس سے معلوم کرتا ہوں کہ اس سلسلے میں کیا کیا جا سکتا ہے۔'' اصغر علی نے کہا۔

پھر اس نے جلدی جلدی ناشتہ کیا تھا اور دفتر جانے کے بجائے وہ ناصر قریشی کے دفتر پہنچ گیا تھا۔



''جرم کیسا بھی ہو...... مجرم کوئی بھی ہو...... سزا تو بھگتنا پڑتی ہی ہے...... ہم کوئی انوکھا کام نہیں کر رہے...... وہ کام جو ہم سب کو مل کر کرنا چاہیے...... ہم ایک مختصر سی ٹیم کی شکل میں کر رہے ہیں...... آپ کے خیالات اچھے ہیں...... پاکیزہ ہیں...... اسی وجہ سے ہم نے آپ کا ساتھ دیا ہے...... ہم قانون کی بالادستی چاہتے ہیں...... اس کے ساتھ ہی ہماری خواہش ہے کہ لوگ ایک دوسرے کا احترام کریں، رشتوں کا خیال کریں...... اور جب ایسا نہیں ہوتا تو مددگار لمیٹڈ ازخود ایکشن میں آ جاتی ہے۔''

یہ تقریر شگفتہ نے کی تھی۔ اس وقت مددگار لمیٹڈ کے دفتر میں شرجیل اور شوکت کے علاوہ ناصر قریشی، اصغر علی اور رقیہ موجود تھے۔

اصغر علی نے ناصر سے بات کی تھی...... اس نے شرجیل سے...... اور پھر شرجیل نے انہیں باجماعت مددگار کے دفتر میں بلوا لیا تھا، جہاں شگفتہ انہیں مددگار لمیٹڈ کے بارے میں بتا رہی تھی۔

''میں اکبر بھائی سے ملا تھا...... وہ اپنے کیے پر نادم ہیں، اسی وجہ سے میں چاہتا ہوں کہ......'' اصغر علی کی بات ادھوری رہ گئی تھی کیونکہ درمیان میں شرجیل بول اٹھا تھا۔

''اصغر صاحب...... آپ ایک اچھے انسان ہیں...... آپ کی سوچ اور خیالات بھی اچھے ہیں...... لیکن اکبر صاحب کے خیالات سے میں اچھی طرح واقف ہوں...... انہوں نے ناصر صاحب کے دفتر میں چوری کروائی...... تمام کاغذات جعلی بنوائے...... ہر ہر قدم پر انہوں نے وہ کام کیا جو اخلاقیات کے بھی منافی تھا......

اور قانون کے بھی...... لہٰذا فی الحال تو انہیں سزا بھگتنے دیں، یہ کم مدت کی سزا شاید ان کی ندامت میں استحکام پیدا کر دے اور وہ تمام عمر...... رشتوں اور قانون کا احترام کرتے رہیں۔"

شرجیل نے انہیں تفصیلات بتاتے ہوئے کہا۔

"اکبر بھائی کے لیے آپ لوگ کچھ نہیں کر سکتے......؟" اصغر علی کا لہجہ عجیب سا ہو رہا تھا۔

"قانونی معاملات میں ہم مجبور ہیں...... ان کی سزا میں کمی تو ہو سکتی ہے...... لیکن ختم نہیں ہو سکتی۔" شرجیل نے حتمی لہجے میں کہا۔

"کمی کیسے ہو سکتی ہے؟" امید بندھنے پر اصغر علی سیدھا ہو کر بیٹھ گیا تھا۔

"آپ کے بیان پر...... جائیداد کا تنازعہ ختم ہو جائے گا لیکن فراڈ کیس ضرور بنے گا۔ آپ کے بیان پر اس میں بھی کچھ نرمی ہو جائے گی۔" شرجیل نے اسے سمجھایا۔

"آپ کے عمل سے مجھے ایک بات کا احساس ہو گیا ہے۔!"

اصغر نے ان لوگوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"کس بات کا......؟" شگفتہ نے پوچھا۔

"اگر نیت اچھی ہو...... تو غیب سے بھی مدد ہوتی ہے......" اصغر علی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں......! کچھ لوگ چوری چھپے بھی کام کر جاتے ہیں اور بہت سے لوگوں کو خبر بھی نہیں ہوتی۔"

شرجیل نے معنی خیز نظروں سے خاموش بیٹھے ہوئے شوکت کی طرف دیکھا تھا جو صرف مسکرا کر رہ گیا تھا۔

☆☆☆

آزادی کا تحفہ!

اچانک ہی بارش شروع ہو گئی تھی۔

ایک ہفتے سے موسم ابر آلود تھا...... محکمہ موسمیات نے پیشن گوئی کی تھی کہ برسات طویل ہو گی مگر روزانہ ہلکی پھلکی پھوار برستی اور بس...... لیکن یہ اچانک شروع ہونے والی بارش...... دس منٹ میں ہی سب کچھ جل تھل ہو گیا تھا۔

شگفتہ اپنی ایک دوست سے ملنے کے لیے ناظم آباد جانا چاہتی تھی۔ اس کی دوست زبیدہ کئی مرتبہ فون کر چکی تھی مگر جب بھی شگفتہ نے اس سے ملنے کا ارادہ کیا...... کوئی نہ کوئی مسئلہ اس کے سامنے آ جاتا۔ وہ کلفٹن سے نکلی تو

اس نے سوچا کہ صدر سے ہوتی ہوئی جائے...... ایک عرصہ ہو گیا تھا اس نے صدر کے راستے سے آنا جانا چھوڑ دیا تھا...... اس کی وجہ صدر کا بے ہنگم رش تھا۔ صدر میں ٹریفک کے کنٹرول کا نظام آج تک درست نہ ہو سکا تھا۔ یہ اندازہ اسے لکی اسٹار سے صدر کی طرف مڑتے ہی ہو گیا تھا۔ یونائیٹڈ ہوٹل سے ایمپریس مارکیٹ تک اسے آدھا گھنٹہ لگ گیا تھا۔ اب وہ پچھتا رہی تھی کہ اس نے خوامخواہ ہی ادھر کا رُخ کیا۔

اس وقت وہ رستہ کھلنے کا انتظار کر رہی تھی' ٹریفک صدر سے ریگل کی طرف چل رہا تھا۔ اچانک سورج غائب ہو گیا اور تیز ہواؤں کے جھکڑ چلنے لگے۔ اس نے جلدی جلدی کار کے شیشے چڑھا دیے لیکن اس کے باوجود اندر گرد و غبار بھر گیا تھا۔ تین چار منٹ بعد ہی بارش کے موٹے موٹے قطرے گرنا شروع ہو گئے اور پھر بارش شروع ہوئی ہے تو دیکھتے ہی دیکھتے جل تھل ہو گیا۔ اس ہڑبونگ میں ہر شخص نے پہلے نکلنے کی کوشش میں جہاں سے گاڑی نکلنے کی گنجائش محسوس کی' ادھر گھس گیا۔ اس صورت حال نے بڑی پیچیدگی پیدا کر دی اور اس کے نتیجے میں ٹریفک جام ہو گیا۔ بہت دور تک گاڑیاں الٹی سیدھی پھنس گئیں۔

بارش تو پندرہ منٹ کے بعد ہلکی پھوار کی صورت اختیار کر چکی تھی مگر ٹریفک اسی طرح جام رہا۔ پھر کہیں سے ٹریفک پولیس کے چند افراد اس طرف آ گئے۔ انہوں نے ایک ایک گاڑی کے لیے رستہ بنانا شروع کیا۔ شگفتہ تین بجے گھر سے نکلی تھی۔ جس وقت اسے رستہ ملا اور وہ ایم اے جناح روڈ تک پہنچی تو مغرب ہو چکی تھی اور اس وقت ساڑھے سات بج رہے تھے۔ ہر طرف ٹھیک ٹھاک پانی جمع تھا اور ڈرائیور حضرات خواہ وہ بڑی گاڑی میں ہوں، چھوٹی میں یا صرف موٹر سائیکل پر...... بڑے بے ہنگم طریقے سے چلا رہے تھے، کسی کو اتنا بھی خیال نہ تھا کہ سڑک کے کنارے کھڑے ہوئے لوگ ان کی گاڑیوں کے ٹائروں سے اڑنے والے چھینٹوں سے متاثر ہو رہے ہیں۔

بارش، پھوار کی شکل میں اب بھی جاری تھی۔ ہر شخص گھر جلدی پہنچنے کے چکر میں تھا' جس کی وجہ سے سڑکوں پر بے پناہ رش تھا۔ بہت سے لوگ بسوں وغیرہ میں جگہ نہ ملنے کی وجہ سے پیدل ہی چل پڑے تھے۔ بجلی معمول کے مطابق غائب تھی اور ایسے میں گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس بہت غنیمت محسوس ہو رہی تھیں۔

نمائش چورنگی پر بھی ٹھیک ٹھاک رش تھا۔ شگفتہ کو ٹریفک رکنے کی وجہ سے اپنی کار بھی روکنا پڑی تھی۔ اس نے شروع سے ہی اپنی کار فٹ پاتھ کے قریب رکھی تھی۔ لوگ گاڑیوں کے درمیان سے گزر کر سڑک پار کر رہے تھے۔ شگفتہ ونڈ اسکرین سے باہر ہی دیکھ رہی تھی کہ اچانک اس کی نظریں ایک شخص پر پڑیں...... وہ غالباً کوئی چیز گھسیٹ

رہا تھا' کیونکہ اس کے چلنے کے انداز سے ایسا ہی ظاہر ہو رہا تھا۔ پھر وہ مختلف گاڑیوں کے آگے پیچھے سے گزرتا ہوا شگفتہ کی گاڑی کے سامنے آ گیا۔

شگفتہ کو ایک جھٹکا سا لگا تھا۔ بات ہی ایسی تھی۔ اس نے جو کچھ دیکھا تھا' وہ شدید قسم کا جھٹکا پہنچانے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ اس شخص نے ایک بچی کی قمیض اور سر کے بال مٹھی میں جکڑ رکھے تھے اور وہ بچی...... مچل رہی تھی...... تڑپ رہی تھی...... روتے روتے اس سے کہہ بھی رہی تھی۔

''چھوڑیں...... انکل...... آئندہ نہیں کروں گی...... چھوڑ دیں......''

لیکن لگتا تھا کہ اس شخص کے اندر انسانی ہمدردی اور محبت جیسے جذبات مردہ ہو چکے تھے۔ وہ اسے اسی طرح گھسیٹ کر لے جا رہا تھا۔ شگفتہ نے کار کے دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکا اور اسے کھولنا ہی چاہتی تھی کہ اچانک ہی گاڑیوں کے پرشور ہارن نے اسے چونکا دیا۔ ٹریفک سگنل کھل چکا تھا اور اس کے پیچھے کھڑی گاڑیوں نے ہارن دینا شروع کر دیے تھے۔ شگفتہ نے گاڑی آگے بڑھائی اور سگنل کراس کرنے کے بعد بائیں طرف کی گلی کے کنارے کار روکی اور اسے لاک کر کے بڑی تیزی سے سگنل کے قریب پہنچی' جہاں اس نے اس آدمی اور بچی کو دیکھا تھا۔ بارش اور ٹریفک کی وجہ سے بے شمار پریشان لوگوں کے درمیان وہ تیزی سے راستہ بناتی ہوئی انہیں تلاش کر رہی تھی۔ نا جانے وہ اتنی سی دیر میں کہاں غائب ہو گئے تھے۔ شگفتہ نے ان دونوں کو کافی دیر تک اِدھر اُدھر تلاش کیا تھا اور آخر کار مایوس ہو کر وہ اپنی کار کے پاس آ گئی تھی۔

☆☆

''اللہ کے نام پر پانچ روپے دے دیں...... میرے بہن بھائی بھوکے ہیں...... روٹی کھانی ہے!''

شرجیل نے چونک کر اس آواز کی طرف دیکھا تھا۔

ایک نو دس سال کی بچی...... چہرے پر معصومیت...... اس کے سامنے ہاتھ پھیلائے کھڑی تھی۔

وہ ایک کلائنٹ سے مل کر واپس سٹی کورٹ جا رہا تھا کہ اسے نشاط سینما کے سگنل پر گاڑی روکنی پڑی تھی۔ سگنل بند ہونے کے بعد مانگنے والے گاڑیوں پر دھاوا ہی بول دیا کرتے تھے۔ یہ معصوم سی بچی بھی صورت سے فقیر نہ لگی تھی۔

شرجیل نے اس کی طرف دیکھا اور ڈیش بورڈ سے اپنا پرس اُٹھایا۔ اس نے پانچ کا ایک نوٹ نکال کر اس بچی کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

''اللہ آپ کا بھلا کرے بابو جی......'' بچی نے نوٹ لیا اور دوسری گاڑی کی طرف بڑھ گئی۔ شرجیل اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اچانک سگنل کھلا اور اس نے گاڑی گیئر میں ڈال کر آگے بڑھا دی۔ اس کی نظر میں بچی کا چہرہ گھوم رہا تھا۔ شاید وہ کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے بچی کو پہلے بھی کہیں دیکھا تھا...... مگر کہاں...... اسے یاد نہ آیا تو اس نے سر جھٹک دیا...... بعض اوقات چہروں میں مماثلت بھی ہوتی ہے۔

اس کے پاس کوئی خاص کیس تو تھا نہیں...... اس لیے وہ پارکنگ میں گاڑی کھڑی کرنے کے بعد اپنے دفتر جانے کے بجائے اپنے دوست سہیل ایڈووکیٹ کے دفتر میں پہنچ گیا۔

''زہے نصیب...... آج یہ چاند کدھر سے نکل آیا؟'' سہیل نے مسکراتے ہوئے اس کا استقبال کیا۔

''بس آج مصروفیت کوئی نہ تھی...... اس لیے سوچا کہ آج تم سے مل لیا جائے۔'' شرجیل نے جواب دیا۔

''کیا چلے گا؟'' سہیل نے اس کے بیٹھنے کے بعد پوچھا۔

''کیوں، بھگانا چاہتے ہو؟'' شرجیل نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

''ارے نہیں بھئی...... میں نے تو ایسے ہی پوچھا ہے!'' سہیل نے کہا۔

''کام کیسا چل رہا ہے؟'' شرجیل نے قدرے سنجیدہ ہوتے ہوئے پوچھا۔

''تمہیں تو معلوم ہی ہے شرجیل...... کہ وکیل بھی بھوکا نہیں رہے گا...... ہمارے ہاں کا نظام ہی ایسا ہے کہ جب تک کسی مقدمے کے لیے وکیل کی خدمات حاصل نہ کی جائیں، کیس عدالت تک نہیں پہنچتا...... اور عدالت میں پہنچنے کے بعد اس کا جو حال ہوتا ہے، وہ بھی کسی سے پوشیدہ نہیں...... ایک معمولی سا کیس بھی ایک طویل عرصہ کھینچ لیتا ہے...... یہ عدالت کی نہیں، نظام کی خرابی ہے۔'' سہیل نے کہا۔

''خیریت تو ہے...... آج بڑے سنجیدہ نظر آ رہے ہو؟'' شرجیل نے پہلو بدلتے ہوئے پوچھا۔

''بس یار...... کبھی کبھار اس نظام سے بیزاریت سی محسوس ہوتی ہے......'' سہیل نے کہا۔ ''ہمارے ہاں کب وہ نظام رائج ہوگا کہ فیصلے بروقت ہوا کریں گے۔''

''کسی کیس میں الجھے ہوئے ہو؟'' شرجیل نے سوال کیا۔

''ہاں بھائی...... کیس ایسا ہے کہ گواہ بھی موجود ہیں...... کسی قسم کی کوئی الجھن بھی نہیں ہے...... بس رہ گیا ہمارا نظام...... سو اسی کو بھگت رہے ہیں۔'' سہیل نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔

''کیس کیا ہے؟'' شرجیل کو اب اس میں دلچسپی محسوس ہونے لگی تھی۔

''اغوا کا کیس ہے...... '' سہیل نے بتایا شروع کیا۔ '' آج سے چھ ماہ قبل تین بچوں کو اغواء کیا گیا تھا۔ ان بچوں کے والدین سے تاوان کا مطالبہ کیا گیا اور پولیس نے اغواء کنندگان کو تاوان وصول کرتے وقت گرفتار کرلیا' کیس بنا اور عدالت میں پیش ہوا' بچے برآمد ہوگئے...... انہوں نے مجرمان کو شناخت کرلیا تھا۔ پولیس تو ان کو عدالت کو سونپ کر خاموش ہوگئی۔ والدین میں سے ایک نے میری خدمات حاصل کیں...... اب تک مجرم ہر پیشی پر عدالت میں حاضر ہوتے رہے ہیں لیکن فیصلہ...... فیصلہ ابھی تک باقی ہے۔'' سہیل نے ٹھنڈی سانس بھری تھی۔

''اب کیا رہ گیا ہے......؟'' شرجیل نے دریافت کیا۔

''اب صرف ایک مجرم رہ گیا ہے...... '' سہیل نے تلخی سے کہا۔ ''بقیہ چار کو شبہ کا فائدہ دیتے ہوئے باعزت بری کردیا گیا ہے...... وہ ایک بھی صرف اس لیے بچ گیا ہے کہ اس کی پشت پر کوئی نہیں ہے...... میں جانتا ہوں کہ اس کا کوئی کردار بھی نہیں تھا اس معاملے میں......!''

''پھر......؟'' شرجیل نے حیرت سے پوچھا۔

''اب مجھے دھمکیاں مل رہی ہیں...... کہ اس کیس سے ہٹ جاؤں...... '' سہیل تلخی سے ہنسا۔

''تم مجھے پوری تفصیل بتاؤ...... ہوسکتا ہے کہ میں اس معاملے میں کچھ کرسکوں۔'' شرجیل کو یہ معاملہ دلچسپ محسوس ہورہا تھا۔



شام ہوچکی تھی۔ سورج غروب ہونے میں تھوڑی ہی دیر رہ گئی تھی۔

شگفتہ آج اپنی دوست سے مل کر واپس آرہی تھی۔ اس سے قبل وہ صدر کے راستے جانا چاہتی تھی اور اس کا نتیجہ بھی بھگت چکی تھی مگر آج اس نے سوسائٹی والا رستہ اختیار کیا تھا اور اب وہ اس سے ملنے کے بعد واپس جارہی تھی۔

اس کے برابر والی سیٹ پر بھورے ماموں بیٹھے اپنے محبوب مشغلے میں کھوئے ہوئے تھے یعنی اونگھ رہے تھے۔

گورا قبرستان کا سگنل بند ہونے کی وجہ سے شگفتہ کو بھی اپنی کار روکنا پڑی، اس کی نگاہیں اپنے سامنے گاڑیوں کی قطار کی جانب تھیں۔

''بی بی جی...... اللہ کے نام پر'' شگفتہ نے چونک کر اپنے دائیں جانب دیکھا کیونکہ آواز اسی طرف سے آئی تھی۔

وہی تھی...... بالکل وہی آواز اور شاید چہرہ بھی...... شگفتہ نے پرس کھولا اور دس روپے کا نوٹ نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

''بی بی...... اللہ آپ کو......'' بچی کا جملہ ادھورا رہ گیا تھا۔

''بات سنو...... چار دن پہلے تم مزار قائد کے پاس......'' شگفتہ نے دیکھا کہ اس کے الفاظ سن کر بچی کے چہرے کا رنگ تبدیل ہو گیا تھا۔ ''وہ تم ہی تھیں؟'' شگفتہ نے سوال کیا۔

''مم...... بی بی...... میں نہیں بتا سکتی......'' بچی شاید کسی بات سے خوف زدہ ہو گئی تھی۔

''مجھے بتاؤ کیا بات ہے؟ کس سے خوف زدہ ہو تم......؟'' شگفتہ نے پیار سے پوچھا۔

''کوثر......!'' ایک کرخت آواز آئی۔

لڑکی کا چہرہ خوف سے زرد ہو گیا۔

''جج...... جی انکل......!'' اس نے پلٹ کر دیکھا...... ایک کرخت چہرے والا شخص اس کے قریب آ رہا تھا۔ وہ بھی فقیروں کے مخصوص لباس میں تھا۔

''کیا بات ہے......؟'' اس نے قریب آ کر پوچھا۔

''کچھ...... نہیں انکل......'' کوثر نے خوف زدہ آواز میں جواب دیا۔

''جا بی بی...... اپنا کام کر......!'' اس شخص نے اسی کرخت لہجے میں کہا اور قریب آ کر کوثر کا بازو دبوچ لیا۔

''چل...... میرے ساتھ......'' اس نے اسے گھسیٹا۔

''انکل...... میں چل رہی ہوں...... چھوڑیں انکل......'' کوثر نے کہا۔

'وہی آواز...... وہی لہجہ...... وہی التجا......' شگفتہ اسے پہچان گئی تھی۔

پھر سگنل کھل گیا اور شگفتہ نے دوسری گاڑیوں کے ساتھ گاڑی آگے بڑھا دی۔

''بیٹا...... آگے گاڑی روک دینا۔'' شگفتہ کو آواز آئی تو اس نے چونک کر اپنے برابر بیٹھے ہوئے بھورے ماموں کو تعجب سے دیکھا۔

اس نے سگنل کراس کرنے کے بعد گاڑی ایک سائیڈ پر روک دی۔

''جی ماموں...... اب فرمائیں......؟'' اس نے سوالیہ انداز سے انہیں دیکھا۔

''بس اب تم جاؤ......اللہ بھلا کرے گا۔'' ماموں نے دروازہ کھولا اور نیچے اتر گئے۔

''اور آپ......؟'' شگفتہ نے پوچھا۔

''ہم کل شام کو دفتر میں ملیں گے......!'' ماموں نے کہا اور دروازہ بند کر دیا۔ شگفتہ نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے گاڑی آگے بڑھا دی۔



''ایک منظم گروہ ہے جو اس کے پس پردہ کام کر رہا ہے......ان کا پورا نیٹ ورک ہے جو پورے ملک میں سرگرم ہے۔ کسی نہ کسی حوالے سے وہ ایک دوسرے سے منسلک ہیں......ان میں سے اگر کسی ایک گروہ کو توڑ دیا جائے یا ختم کر دیا جائے تو بات نہیں بنے گی......بہت لمبی پلاننگ کی ضرورت ہے اس کے لیے......!''

مددگار لمیٹڈ کے دفتر میں تمام اراکین بیٹھے اسی مسئلے پر گفتگو کر رہے تھے۔ شگفتہ نے بھورے ماموں سے ملنے والی رپورٹ شرجیل اور شوکت کی بتائی تھی۔ شوکت نے اس سلسلے میں پوری معلومات حاصل کر لی تھیں۔ اسی نے ان لوگوں سے یہ جملے کہے تھے۔

''پھر اس سلسلے میں کیا کیا جا سکتا ہے......؟'' شرجیل نے شوکت کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا تھا۔

''بے حد مشکل ہے شرجیل......یہ ایک معاملہ ایسا ہے کہ اس کے پشت پناہوں میں بڑے بڑے نام ملوث ہیں......'' شوکت نے بے چارگی سے کہا تھا۔

''تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم خاموش بیٹھ جائیں......؟'' شگفتہ نے تنک کر کہا تھا۔

''نہیں......شگفتہ!......ہم اس معاملے میں خاموش نہیں رہیں گے......فی الحال میں نے ان کے دو پوائنٹس پر کام شروع کر دیا ہے......جیسے ہی رپورٹ ملے گی......ہم کام شروع کر دیں گے۔ اس دوران ہمیں چند ایک کام کرنا ہوں گے۔'' شوکت نے ان تینوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

''کون سے کام......؟'' شرجیل بولا تھا۔

''مختصر اً بتاتا ہوں......بقیہ آپ لوگوں پر ہے......کہ اسے کس طرح انجام دیتے ہیں۔'' شوکت نے کہا۔

''ہاں بولو......کیا پلاننگ کی ہے تم نے......؟'' شرجیل بولا۔

پھر شوکت ان کو باری باری ان کا کام سمجھانے لگا۔



مزارِ قائد کے گرد بکھرے ہوئے فقیروں میں ایک نئے فقیر کا اضافہ ہو گیا تھا۔ اس بات کو کسی اور نے محسوس کیا ہو یا نہیں...... البتہ فقیروں نے ضرور محسوس کیا تھا۔

یہ ایک دبلا پتلا سا...... الجھے الجھے لمبے بالوں والا شخص تھا...... جس کا چہرہ اس کے بکھرے بالوں میں چھپ گیا تھا۔ بغور دیکھنے سے معلوم ہوتا کہ اس کے چہرے کی جلد گویا کسی شے سے جھلس کر سیاہ مائل ہو چکی تھی۔ یہ بھورے ماموں تھے۔

ان کا یہ میک اَپ شوکت کے فن کا بہترین نمونہ تھا۔

بھورے ماموں صبح سویرے ہی وہاں پہنچ گئے تھے۔ کئی فقیر ادھر ادھر مختلف جگہوں پر سو رہے تھے۔ بھورے ماموں بھی مزارِ قائد کے بیرونی جنگلے کے ساتھ اپنی بوری بچھا کر لیٹ گئے۔ ویسے بھی ان کا تعلق جس طبقے سے تھا' وہ اس کے عادی تھے۔ ماضی تو محض خواب تھا۔ تقسیم سے قبل وہ کیا تھے اور کس خاندان سے تعلق رکھتے تھے انہوں نے کسی کو نہیں بتایا تھا۔ لوگوں نے تو ان کا حال ہی دیکھا تھا' ماضی سے کسی کو غرض نہ تھی۔ بہر حال انہیں ایک با عزت مقام ملا ہوا تھا اور وہ اس پر شاکر تھے۔

دن نکلا، سورج کی تمازت میں اضافہ ہوا تو ٹریفک میں بھی اضافہ ہونا شروع ہو گیا۔ مستقل ڈیرہ ڈالنے والے فقیروں نے جب اپنے درمیان ایک اضافہ دیکھا تو ان میں سے ہر ایک کی پیشانی پر بل پڑ گئے تھے۔ بھورے ماموں بظاہر بے پرواسے نظر آ رہے تھے مگر وہ ہر ایک کے انداز کو بغور محسوس کر رہے تھے۔

پھر جب فقیروں میں 'چہل پہل' شروع ہوئی تو بھورے ماموں بھی اپنی جگہ سے اُٹھے اور آہستہ آہستہ چلتے ہوئے بس اسٹاپ کے پاس چلے آئے۔ انہوں نے اب تک نہ تو کسی کے آگے ہاتھ پھیلائے تھے اور نہ ہی کسی قسم کی صدا لگائی تھی۔

آنے جانے والوں نے بھی اس فقیرانہ حلیے کے شخص کو حیرت سے دیکھا تھا کیونکہ اس قبل اس کا وجود نہ تھا۔ بہر حال لوگوں نے اس بے پرواشخص کی طرف چند سکے بڑھا دیے تھے' جو قبول کر لیے گئے تھے۔

صبح سے دوپہر ہو گئی اور پھر...... دوپہر کے دو بجے کے قریب فٹ پاتھ کے پاس ایک سفید کرولا آ کر رکی۔ چند ایک فقیر بظاہر اس انداز سے آگے بڑھے گویا وہ مانگنے کی نیت رکھتے ہوں...... وہ سب باری باری چند منٹ تک اس کار سوار کے پاس گئے تھے اور پھر وہ کار چلی گئی۔

بھورے ماموں وہاں سے کافی فاصلے پر کن اکھیوں سے اس پورے ''سیٹ اپ'' کا جائزہ لے رہے تھے۔

کافی دیر گزر گئی تھی۔ بھورے ماموں کو بھوک کا احساس ہو رہا تھا۔ پھر قبل اس کے کہ وہ اٹھتے اور کھانے کے لیے کسی طرف کا رُخ کرتے...... ایک پولیس موبائل ٹھیک ان کے قریب آ کر رکی۔

''بابیو...... کی ہو ریا اے......!'' ایک پولیس والا موبائل سے اتر کر ان کے قریب آ گیا۔

''حق اللہ......'' بھورے ماموں نے ایک انگلی اوپر اُٹھا کر جواب دیا۔

''اوئے بابے...... تمہیں معلوم نہیں کہ یہاں بھیک مانگنا منع ہے؟'' دوسرے پولیس والے نے ان سے کہا۔

''حق......!'' بھورے ماموں کی آواز حلق میں ہی گھٹ گئی۔

''تھانے چلو بابا......'' دوسرے پولیس والے نے ان کا ہاتھ پکڑ کر اُٹھا دیا تھا۔

اس لمحے اگر بھورے ماموں چاہتے تو مزاحمت بھی کر سکتے تھے اور اپنے دماغ کا استعمال بھی...... مگر اس طرح ان کا پول کھل جاتا جو وہ کسی صورت نہیں چاہتے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ شوکت وغیرہ اس بات سے غافل نہیں ہوں گے۔ یہ سوچ کر وہ بالکل خاموشی سے اُٹھے اور ان کے ہمراہ جا کر موبائل میں بیٹھ گئے۔

پولیس والوں نے مزید تین افراد کو صدر، تبت سینٹر، گورا قبرستان سے اُٹھایا تھا۔ اس کے بعد وہ ان چاروں کو لے کر سی آئی اے سینٹر صدر برانچ میں لے آئے تھے۔ انہیں موبائل سے اتار کر جس کمرے میں لے جا کر بٹھایا گیا' وہاں پہلے سے چار افراد فرش پر اکڑوں بیٹھے تھے۔ ان لوگوں کو لانے والے تو کمرہ بند کر کے چلے گئے اور ان کے جانے کے بعد وہ سب ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ کسی نے بھی ایک دوسرے سے بات کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

تقریباً ایک گھنٹہ اس طرح خاموشی سے گزر گیا۔ پھر اچانک ہی ایسا لگا تھا کہ گویا تھانے میں بھونچال آ گیا ہو۔ لوگوں کے بھاگنے دوڑنے کی آوازیں آنے لگیں۔ پھر ایک دم سے ان کے کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک انسپکٹر تیزی سے اندر آ گیا۔

''چلو...... نکلو...... جلدی کرو......'' اس نے بدحواسی میں کہا۔

''کہاں...... کہاں چلنا ہے......؟'' ایک شخص نے کھڑے ہو کر پوچھا۔

''ارے بھاگ جاؤ سب لوگ...... چلو......'' انسپکٹر نے تیزی سے کہا۔ اس کے الفاظ نے گویا ان لوگوں میں بجلی سی بھر دی تھی۔ ایک منٹ کے اندر اندر سب لوگ سی آئی اے سینٹر سے باہر تھے اور اس کے برابر والی گلی میں دوڑ رہے تھے۔



اندر کی سجاوٹ سے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ یہ کمرہ کسی پوش علاقے میں واقع کسی بنگلے کا ہوسکتا ہے لیکن ایسا نہیں تھا۔ یہ کمرہ جس مکان کا تھا۔ وہ اورنگی ٹاؤن جیسی پسماندہ بستی میں واقع تھا۔

اس کمرے میں اعلیٰ قسم کا فرنیچر، فرشی قالین، دیواروں پر قیمتی آرائشی اشیاء، رنگین ٹی وی، ریفریجریٹر اور نہ جانے کیا کیا بھرا تھا۔ وسعت کے اعتبار سے بھی یہ کافی کشادہ تھا۔

اس وقت اس کمرے میں کل آٹھ افراد موجود تھے۔ ان میں سے دو مسلح تھے، ایک لمبا چوڑا، بھاری بدن کا، خوفناک چہرے کا مالک صوفے پر بیٹھا تھا جبکہ بقیہ پانچ افراد اس کے سامنے والے صوفے پر مؤدب بیٹھے ہوئے تھے۔

''آخر یہ کون سی پارٹی ہے...... میں نے اس سے پہلے ایسا کبھی نہیں دیکھا؟'' صوفے پر بیٹھے ہوئے خوفناک چہرے کے مالک نے ان سے پوچھا۔

''جگو دادا...... میں نے تو ان کو اُٹھوا دیا تھا...... لیکن لگتا ہے سالوں کی قسمت اچھی تھی......!'' سامنے بیٹھے ہوئے ایک شخص نے اس سے کہا۔

''کیا مطلب...... کیا ہوا......؟'' جگو دادا نے حیرت سے پوچھا۔

''اچانک ہی ڈی آئی جی نے دورہ کرلیا...... اب بھلا ایسے میں وہ اپنے اوپر بات کیسے آنے دیتے...... بس بھگا دیا سالوں کو......!'' اسی شخص نے جواب دیا۔

''بہرحال ہم اپنے بندوں کو بھی جانتے ہیں اور ان مستقل بندوں کو بھی...... اگر یہ مستقل بندے نہ ہوں تو اپنے بزنس کو سہارا نہ ملے...... انہی کی وجہ سے کسی کو شبہ بھی نہیں ہوتا......'' جگو دادا نے ان کی طرف بغور دیکھتے ہوئے کہا پھر بولا۔''ہاں بھئی بابو...... نئی کھیپ کا کیا حال ہے؟''

اس کے سامنے بیٹھے ہوئے درمیان والے شخص نے جسے مخاطب کیا گیا تھا' کہا:''دادا...... بس تین دانے تنگ کررہے ہیں...... ان کو لمبے علاج کی ضرورت ہے......!''

''اس کے لیے تم کرم خان سے رابطہ کرو......!'' جگو دادا نے کہا۔

''تینوں کو اس کے حوالے کرچکے ہیں دادا...... کیونکہ دس دن بعد دوسری کھیپ بھی آنے والی ہے۔'' بابو نے جواب دیا۔

''دبئی کی پارٹی سے بات ہوئی...... کیوں بھئی بھولو...... تم نے بات کی تھی ان سے......؟'' جگو نے ایک کنارے پر بیٹھے ہوئے شخص سے پوچھا۔

''بات تو ہوگئی ہے دادا...... لیکن آج کل کراچی کے حالات خراب چل رہے ہیں...... نئی کھیپ کو رکھنے کا بھی مسئلہ ہے؟'' بھولو نے پریشانی سے کہا۔

''کیوں شیر شاہ والے اڈے کا کیا بنا......؟'' جگو' جو پہلے ترچھا ہوکر بیٹھا تھا' سیدھا ہوکر بیٹھ گیا۔

''دادا...... وہ سہراب گوٹھ سے کافی دور ہے...... میرا خیال ہے کہ اس مرتبہ سرجانی والے اڈے کو استعمال کرتے ہیں اس کی طرف آج تک کسی کی نظر نہیں پہنچی...... وہ ایک مرتبہ بھی استعمال نہیں ہوا۔'' بھولو نے تجویز پیش کی۔

''گڈ......'' جگو نے اسے تعریفی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کافی ہوشیار ہوتے جا رہے ہو۔!''

''دادا...... اس نئے مسئلے کا کیا کرنا ہے؟'' بابو کے برابر بیٹھے ہوئے شاہد نے پوچھا۔

''فی الحال تو چلنے دو...... میرے خیال میں ان کا تعلق کسی پارٹی سے نہیں ہوسکتا...... ہوسکتا ہے کہ وہ کسی شہر سے یہاں کمانے کے لیے آگئے ہوں...... بہرحال تھوڑا ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔'' جگو دادا نے اطمینان سے جواب دیا۔

اتنے میں جگو کے سامنے میز پر رکھے ہوئے موبائل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔

جگو نے ڈسپلے پر نام دیکھا اور ان پانچوں کو جانے کا اشارہ کیا۔ ان کے جانے کے بعد اس نے موبائل فون کان سے لگاتے ہوئے بٹن دبایا۔

''ہاں سیٹھ...... جگو بات کر رہا ہوں۔''

''کھیپ کب آرہی ہے؟'' دوسری جانب سے پوچھا گیا۔

''ایک ہفتے بعد......!''

''کوئی مسئلہ......؟'' پھر پوچھا گیا۔

''نہیں فی الحال تو نہیں ہے...... کھیپ آنے کے بعد اطلاع دوں گا۔'' جگو نے کہا' اس کے بعد شاید فون بند کر دیا گیا تھا۔

”دادا..... کرم خان آیا ہے.....!“ ایک شخص نے دروازے سے اندر آ کر بتایا۔

”بھیج دو.....“ جگو نے کہا۔

تھوڑی دیر کے بعد جو شخص اندر داخل ہوا' وہ وہی تھا جو شگفتہ کو مانگنے والی بچی کے ساتھ ملا تھا۔



ہوٹل پیراڈائز کے وسیع ہال میں بہت کم میزیں آباد تھیں۔ رات کے اس وقت یہاں جگہ بمشکل ہی ملا کرتی تھی لیکن آج پیٹرول کی مہنگائی کے خلاف ٹرانسپورٹرز کی ہڑتال کے سبب پورے شہر میں ہی چہل پہل میں کمی تھی تو پھر بھلا ہوٹل میں رونق کہاں سے ہوتی؟۔

بالکل اندرونی جانب، دیوار کے قریب ایک میز پر پانچ خوش پوش نوجوان کھانا کھانے میں مصروف تھے۔ کسی بھی لحاظ سے یہ بات ظاہر نہیں ہو رہی تھی کہ وہ بظاہر کھانا کھا رہے تھے مگر درحقیقت وہ ایک اہم اور حساس موضوع پر بات کر رہے تھے۔ یہ میز چونکہ چھوٹی سی تھی اور اس کے گرد کرسیاں بچھی تھیں لہٰذا ان کے درمیان فاصلہ بھی بہت کم تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ جو باتیں کر رہے تھے' وہ کسی اور کو سنائی نہیں دی جا سکتی تھیں۔

”مزید کوئی پیش رفت.....؟“ ایک نمایاں حیثیت کے حامل نوجوان نے لقمہ چباتے ہوئے ان سے پوچھا۔

”برادر..... فی الحال تو اس پر کام جاری ہے..... ویسے بہت جلد اس کے نتائج سامنے آئیں گے.....“ ان میں سے ایک نے کہا۔

”شاکر..... تم کیا کہتے ہو؟“ اسی نوجوان نے دوسرے سے پوچھا۔

”میں نے سہراب گوٹھ پر جال بچھا دیا ہے..... ایک خبر ملی ہے..... ممکن ہے اسی سے ہمیں راستہ مل جائے۔“ شاکر نے لقمہ منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔

”شکیل..... تم نے رستم خان سے بات کی.....؟“ اس نے تیسرے نوجوان سے پوچھا۔

”ہاں..... لیکن مجھے لگتا ہے کہ بات صرف یہیں تک نہیں ہے..... بلکہ اس سے آگے بھی بہت کچھ ہے۔ فی الحال تو میں نے رستم خان کو اپنے شکنجے میں جکڑ لیا ہے۔“ شکیل نے تفصیل سے بتایا۔

”ٹھیک ہے..... اس کا مطلب ہے کہ کام تسلی بخش ہے.....“ اس خوش رو نوجوان نے اپنے چہرے پر موجود چشمے کو درست کیا۔ پھر ان سے مخاطب ہوا۔

"اب میٹنگ ختم......کھانا ختم کرو......اور اپنے اپنے کام پر نکل جاؤ۔"

تھوڑی دیر کے بعد وہ چاروں تو چلے گئے مگر وہ نوجوان بیٹھا رہا۔ اس کے انداز سے لگ رہا تھا کہ اسے کسی کا انتظار ہے کیونکہ وہ بار بار گھڑی دیکھ رہا تھا۔

آدھے گھنٹے کے بعد باہر ایک سرخ شیراڈ آ کر رکی اور اس میں سے ایک نوجوان لڑکی اور ایک خوبصورت نوجوان برآمد ہوئے۔ گاڑی لاک کرنے کے بعد وہ ہال میں داخل ہوئے اور سیدھے اسی میز پر پہنچے جہاں وہ نوجوان بیٹھا تھا۔ اس وقت اسی نوجوان کے چہرے پر حماقت کے آثار تھے۔ آنے والے شگفتہ اور شرجیل تھے جبکہ بیٹھا ہوا نوجوان سو فیصد شوکت تھا۔



شام کے پانچ بج رہے تھے، ہر طرف افراتفری کا سماں تھا۔ ہر شخص جلدی میں تھا۔ دکاندار حضرات چیزیں سمیٹ رہے تھے۔ پھل والوں کے ٹھیلوں پر لوگوں کا رش تھا۔ جگہ جگہ سے پکوڑے اور سموسے تلنے کی خوشبو آ رہی تھی۔ آج پہلا روزہ تھا اور یہ جلدی اسی سلسلے میں تھی کہ ہر شخص افطار سے قبل اپنے گھر پہنچنا چاہتا تھا۔

کراچی میں سیزن کمانے کے لیے آنے والے فقیروں کی ٹولیاں جگہ جگہ گھوم پھر رہی تھیں۔ کرم خان، وہ شخص تھا جو جگو دادا کے گروہ سے تعلق رکھتا تھا۔ وہ اس وقت صدر میں گھوم رہا تھا۔ اس کا کام اپنے کارندوں کی نگرانی تھا۔ اس وقت صدر میں گھومنے والے بیس فیصد بچے اس کے گروہ سے تعلق رکھتے تھے۔ افطار کے لیے جیسے ہی سائرن بجا......لوگ ٹولیوں کی شکل میں کھڑے ہو گئے......کھانے پینے کی چیزوں کے لفافوں......تھیلیوں......کے منہ کھل گئے تھے۔ یہ شور شرابا آدھے گھنٹے تک جاری رہا' اس کے بعد رونق ختم ہونا شروع ہو گئی۔ بازار تو پہلے ہی بند ہو چکے تھے......لوگ بھی بسوں وغیرہ میں بیٹھ کر گھروں کو جانے لگے۔ ٹھیلے والے بھی اپنا بچا ہوا سامان سمیٹنے لگے......دو گھنٹے بعد بالکل ویرانی چھا گئی تھی۔

کرم خان آہستہ آہستہ چلتا ہوا......ریگل کی طرف بڑھنے لگا۔ ریگل ٹریڈ سینٹر کے بالکل سامنے ایک گھنے درخت کے نیچے ایک ویگن کھڑی تھی۔ وہ اس کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔ تھوڑے تھوڑے وقفے سے بچے آتے رہے اور ویگن میں بیٹھتے گئے......کچھ بڑے افراد بھی آئے تھے۔ پھر شاید گنتی پوری ہو گئی۔

کرم خان گھوم کر ڈرائیونگ سیٹ کی طرف آیا اور دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گیا۔ اس نے انجن اسٹارٹ کیا اور پھر ویگن وہاں سے آگے بڑھ گئی۔

ویگن کے جانے کے ایک منٹ بعد ہی کچھ دور کھڑی ایک موٹر سائیکل بھی اسی راستے پر چلی گئی، جدھر وہ ویگن گئی تھی۔ سڑک پر ٹریفک برائے نام ہی تھا۔ جس طرح کرم خاں اپنے تعاقب سے بے خبر تھا' اس طرح وہ موٹر سائیکل سوار بھی شاید اپنے تعاقب میں آنے والی ایک نیلی اسپورٹس کار کو آتے محسوس نہ کرسکا تھا۔ جس میں ایک نوجوان لڑکا بیٹھا ہوا تھا۔

ویگن کا رُخ گارڈن...... اور پھر پاک کالونی سے اورنگی کی طرف ہوگیا تھا۔



''مال پہنچ گیا ہے...... پارٹی کب تک آئے گی؟''

وہ ایک لمبا تڑنگا شخص تھا' رات کے اس وقت وہاں پر تقریباً سناٹا چھایا ہوا تھا۔ وہ ایک کار میں بیٹھا ہوا تھا جو تاریکی میں کھڑی ہوئی تھی۔ اس کے کان سے موبائل فون لگا تھا جس پر وہ کسی سے باتیں کررہا تھا۔

''تم اس وقت کہاں ہو؟'' دوسری جانب سے ایک کرخت آواز میں پوچھا گیا۔

''گرین پوائنٹ کے قریب......!'' اس نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے...... تم اڈے پر پہنچو...... میں آرہا ہوں۔'' دوسری جانب سے اتنا کہنے کے بعد فون بند کردیا گیا۔ اس نے موبائل فون جیب میں رکھا اور کار اسٹارٹ کرکے سڑک پر آگیا۔ یہ یحیٰی حسن کا علاقہ تھا' وہ اس وقت سرجانی ٹاؤن کی طرف جارہا تھا۔

سرجانی چورنگی سے وہ بائیں طرف مڑ گیا تھا۔ وہ جیسے ہی چورنگی مڑا' اسے احساس ہوا تھا کہ کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹس بھی اسی جانب گھومی تھیں۔ اس نے عقب نما میں دیکھا' وہ ایک موٹر سائیکل تھی جو مناسب رفتار سے اس کے پیچھے چل رہی تھی۔ اس نے ویسے ہی اپنی کار کی رفتار دھیمی کردی لیکن موٹر سائیکل اسی رفتار سے چلتی ہوئی اس کے قریب سے گزر کر آگے چلی گئی۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ ایک گلی میں مڑ رہا تھا۔ اس نے کچھ دور جا کر گاڑی روکی اور نیچے اتر آیا۔ کچھ دیر کے بعد وہ اسی مکان میں تھا جہاں اس نے گاڑی روکی تھی۔

یہ کافی کشادہ مکان تھا۔ ایک کمرے سے بچوں کے رونے کی آوازیں آرہی تھیں جبکہ دوسرے کمرے میں' جو کھلا ہوا تھا' اچھی خاصی روشنی تھی اور قہقہے سنائی دے رہے تھے۔

وہ اندر داخل ہوا تو اندر کمرے میں چار افراد تاش کھیل رہے تھے۔ شراب کی بوتلیں ان کے سامنے کھلی رکھی تھیں اور ان کے ساتھ ہی چار ریوالور بھی پڑے ہوئے تھے۔

''باس آ گئے......!'' اس آواز پر بقیہ تین نے سر اٹھا کر اسے دیکھا اور مؤدب انداز میں کھڑے ہو گئے۔

''کیا ہو رہا ہے......؟'' آنے والے نے جو ان کا باس تھا' ان سے پوچھا۔

''سب ٹھیک ہے باس!'' ایک نے اطمینان سے جواب دیا۔

''ٹائیگر آ رہا ہے...... جب تک مال اسے نہ سونپ دیا جائے...... سب ٹھیک نہیں ہو سکتا۔'' باس نے کہا تو ان کے چہرے پر الجھن کے آثار نمودار ہو گئے۔

''کوئی مسئلہ ہے کیا...... باس؟'' دوسرے نے پریشان لہجے میں پوچھا۔

''ہو بھی سکتا ہے...... باہر کون کون ہے؟'' باس نے دوبارہ پوچھا۔

''اکرم، چھوٹو، بالا...... تینوں ہوشیار ہیں باس!'' پہلے والے نے کہا۔

اسی وقت باہر سے کچھ آوازیں آئیں تو سب ہوشیار ہو گئے۔

دو خطرناک قسم کے بدمعاش ایک نوجوان کو ریوالور کی زد میں لیے ہوئے اندر داخل ہوئے۔

''باس...... یہ دو چکر لگا چکا ہے...... تیسرے چکر میں ہم نے چھاپ لیا......'' آنے والے بالا اور اکرم تھے۔

''ہوں......'' باس نے ہنکارہ بھرا۔ ''معلوم کرو کون ہے یہ؟''

''او کے باس!'' بالے نے کہا اور اسے وہاں سے باہر دوسرے کمرے میں لے گیا جو اسی کمرے کے سامنے ہی تھا' جس سے بچوں کے رونے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

''سیدھی طرح بتاؤ بیٹا...... ورنہ بولتی بند ہو جائے گی۔'' اکرم نے خوفناک لہجے میں ریوالور لہراتے ہوئے کہا تھا۔

''میں تو...... ایک پتا ڈھونڈ رہا تھا......!'' اس نوجوان نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔

''کس کا پتا ڈھونڈ رہا تھا......؟'' بالے نے مزاحیہ لہجے میں دریافت کیا۔

''اپنے ماموں کا...... وہ یہیں کہیں رہتے ہیں!'' نوجوان نے کہا۔

''بیٹا...... ہم ہی تمہارے ماموں ہیں...... گھاس نہیں چھیلی ہے ہم نے...... اب ٹھیک ٹھیک بتا دے ورنہ......؟'' اکرم نے دھمکی دی۔

''ورنہ......؟''نوجوان اس مرتبہ مسکرایا تھا۔

''ورنہ...... بتاؤں تجھے......؟''بالا دو قدم آگے بڑھا تھا۔

''ایک منٹ......!!''نوجوان نے اپنے چہرے سے چشمہ اتارا اور اپنے گریبان میں ڈال لیا۔

بالا اور اکرم اسے حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ وہ نوجوان جو کچھ دیر قبل خوف زدہ سا محسوس ہو رہا تھا' اب اس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔

پھر قبل اس کے کہ وہ دونوں کچھ سمجھتے' نوجوان بجلی کی سی تیزی سے اچھلا تھا۔ اس نے اچھل کر دونوں کے سینے پر فلائنگ کک جما دی تھی۔ اکرم تو اسی وقت لمبا لیٹ گیا تھا' شاید ضرب کچھ زیادہ ہی شدید تھی مگر بالا کچھ سنبھل کر دوبارہ اُٹھا تھا۔ اس کا دوبارہ اُٹھنا بے کار ہی گیا تھا کیونکہ نوجوان کی ٹھوکر نے اس کی کنپٹی سہلا دی تھی۔

نوجوان نے ان دونوں کے ریوالور اُٹھائے اور کمرے سے باہر آ گیا لیکن اس سے قبل اس نے اپنا چشمہ دوبارہ ناک پر جما لیا تھا اور موبائل نکال کر کسی کو ایک مرتبہ رنگ کیا تھا' گویا یہ اشارہ تھا۔

اس پوری دھما چوکڑی کی آوازیں شاید دوسرے کمرے تک نہیں پہنچی تھیں' تبھی وہاں سے کسی ردعمل کا اظہار نہیں ہوا تھا۔

نوجوان کمرے میں داخل ہوا تو اس کے دونوں ہاتھوں میں ریوالور تھے اور ان کا رُخ کمرے میں موجود افراد کی جانب تھا جو اسے دیکھ کر چونک اُٹھے تھے۔

''تم لوگوں کا کھیل ختم ہو گیا ہے۔''نوجوان نے کہا اور ناک سکوڑی گویا وہ ناک پر چشمہ درست کر رہا تھا۔

دس منٹ بھی نہ گزرے تھے کہ پورے علاقے میں پولیس سائرن گونج رہے تھے۔



مددگار لمیٹڈ کے دفتر میں اچھا خاصا مجمع لگا ہوا تھا۔

شرجیل، شگفتہ اور شوکت سامنے بیٹھے تھے، ان کے برابر بھورے ماموں حسب عادت اونگھ رہے تھے۔

شرجیل ان لوگوں کو تفصیل بتا رہا تھا۔

''کھیل ابھی ختم نہیں ہوا ہے دوستو...... ان ننگ انسانیت لوگوں کا کھیل بہت بڑا ہے۔ ہمیں اس خوش فہمی میں نہیں رہنا چاہیے کہ یہ گروہ ٹوٹ گیا ہے۔ نہیں...... فی الحال ہم نے ان کا نیٹ ورک توڑ دیا ہے۔ ان کا اصل

مہرہ ٹائیگر ابھی آزاد ہے...... بہت جلد وہ بھی قانون کی گرفت میں آجائے گا...... اسی طرح دوسرے لوگ بھی جو اس زنجیر کا حصہ ہیں......!''

وہ سانس لینے کے لیے رکا تھا۔ پھر وہ گویا ہوا۔

''یہ لوگ نہ صرف بچوں کو اغوا کرتے تھے بلکہ دوسرے اغوا کنندگان سے خرید و فروخت بھی کرتے تھے۔ وہ ان بچوں پر اتنا ذہنی تشدد کرتے تھے کہ یہ معصوم پھول جیسے بچے اپنا ماضی فراموش کر دیتے اور ان کے ہاتھوں میں کھلونا بن جاتے تھے...... یہ لوگ ان معصوموں کو اونٹ ریس کے لیے بھی سپلائی کرتے تھے' جس سے اچھی خاصی آمدنی ہوتی تھی۔ اس پورے معاملے میں جہاں بھورے ماموں نے ان کے نیٹ ورک کا پتا چلایا' وہیں شوکت نے بھی محنت کی...... آپ لوگ بھی شامل ہیں' جن کے تعاون سے ہم یہ مہم سر کرنے میں کامیاب رہے۔ اس عید پر ہماری جانب سے ان معصوموں کو آزادی کا تحفہ ملا ہے...... اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ بہت عظیم تحفہ ہے۔''

''ابھی تک ٹائیگر گینگ کا معاملہ اٹکا ہوا ہے۔!'' شگفتہ نے کہا۔

''وہ بھی بہت جلد شکنجے میں آجائے گا...... ہمارے پاس ہمت ہے، جوش ہے...... جذبہ ہے۔'' شوکت نے مستحکم لہجے میں کہا تھا۔

''...... اور ہمارے پاس آپ ہیں...... اور...... شوکت ہے۔'' شرجیل نے مسکراتے ہوئے پہلے سامنے موجود افراد سے اور آخری جملہ شوکت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو اس نے شرم سے گردن جھکالی۔

